E-Content

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India

Subject / Course - M.A.

Paper : **Religious Thought and Belief in India**

Module Name/Title : **Muslim Muashere Mein Islahi Tahreekein**

DEVELOPMENT TEAM	
CONTENT	DDE SLM/ Dr. Masood Jaffry
PRESENTATION	Dr. Masood Jaffry
PRODUCER	Md. Mujahid Ali

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India
//imcmanuu

REFERENCE ONLY

اکائی 26: اسلام میں اصلاحی تحریکات
REFORM MOVEMENTS IN ISLAM

Structure ساخت

Introduction	تعارف	26.1
Wahabi Movement	وہابی تحریک	26.2
Faraizi Movement	فرائضی تحریک	26.3
Deoband Movement	دیوبند تحریک	26.4
Aligarh Movement	علی گڑھ تحریک	26.5
Summary	تلخیص	26.6
Exercises	مشق	26.7

Introduction 26.1 تعارف

برصغیر ہند میں جب سے اسلام پھیلا ہے تبھی سے مختلف ادوار میں مسلم معاشرے کی اصلاح اور اسلام کی عظمتِ قدیم کے احیاء کے لیے انفرادی اور اجتماعی کوششیں مسلسل ہوتی رہی ہیں۔ بار بار اس کی ضرورت پیش آتی رہی کیونکہ ملک کے غیر مسلم اکثریتی ماحول میں ہمیشہ اس کا خدشہ رہا کہ مسلمان کہیں ایسے رسم ورواج اور عقائد نہ اختیار کرلیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ بدعتیں رواج پانے کی صورت میں ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ مقاصد اور عقائد دھندلے پڑنے لگتے ہیں اور ان کو صحیح سمت میں پھر سے مرکوز کرنے لیے ان کا احیاء ضروری ہوتا ہے۔ مسلمان یہ مانتے ہیں کہ اسلام کے جس ماڈل کی انھیں تقلید کرنی چاہیے وہ حضرت محمدؐ کی حیات پاک کا اور خلفائے راشدین کے دور کا ماڈل ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلم مصلحین اور مذہبی رہ نماؤں نے ہمیشہ اسلام کے ابتدائی دور کی اصل پاکیزگی کو واپس لانے کی ہمیشہ کوششیں کیں جس کے لیے انھوں نے قرآن کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی احادیث کو مشعل راہ بنایا۔ اس ماڈل سے کسی بھی قسم کا انحراف، یا وہ تمام بدعتیں جو اسلام میں شامل ہوئیں ان کو درست اور رد کرنا ضروری تھا۔ اس قسم کی ضرورتوں کو محسوس کر کے جن لوگوں نے عملی قدم اٹھائے ان میں مختلف صوفیہ سلسلوں کے مشائخ بھی شامل تھے جنھوں نے اپنی زبردست اخلاقی قوت اور اپنے شاگردوں کے وسیع نیٹ ورک کی مدد سے اپنے مذہبی تصورات اور خیالات کو پھیلا کر معاشرے کی اصلاح کی کوششیں کیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی کوششوں نے ایسی تحریکوں کی شکل اختیار کر لی جو مسلم معاشرے کے مختلف طبقات پر اثر انداز ہوئیں اور لوگوں کے طرزِ فکر اور طرز معاشرت میں بڑی تبدیلیوں کا باعث بنیں۔ جن لوگوں کی کوششوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی تحریک کی شکلیں اختیار کیں ان میں سید محمد جونپوری، شیخ احمد سرہندی (جو مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہیں) اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام اہم ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں اس بات پر سبھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ مصلحین کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے چلتا رہے گا تاکہ ان کی مذہبی روایات محفوظ رہیں اور اسلام کی اصل روح اور عظمت کو ان تمام اثرات سے پاک رکھا جاسکے جو وقت کے ساتھ اور دوسری قوموں کے ساتھ ربط وضبط کے طویل سلسلے کے سبب اسلام میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ تصور دراصل پیغمبر اسلام کی ایک حدیث پر مبنی ہے جس کے مطابق ہر صدی میں ایک مصلح ضرور آئے گا اور اسلام کی تجدید کر کے اسے اس کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹائے گا۔

انیسویں صدی اس اعتبار سے خصوصاً توجہ طلب ہے کہ اس میں کئی اہم اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا۔ مسلم سیاسی طاقت کے زوال اور برطانوی قوت کے

ہاتھوں اس کی شکست اور ملک کے بیشتر حصوں پر انگریزوں کے قبضے نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جو مسلمانوں نے ہندستان میں اپنی طویل تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسے شدید مسائل سے اب ان کا سامنا تھا جن کے حل پر قوم کا مستقبل منحصر تھا۔ کئی قسم کی تحریکیں اس چیلینج کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور انھوں نے ان پریشان کن مسائل کو اپنے اپنے طور پر حل کرنے کی کوششیں کیں۔ اس اکائی میں اسی پس منظر میں مسلمانوں میں اصلاح کی اہم تحریکات سے آپ کو متعارف کرایا جائے گا۔

26.2 وہابی تحریک Wahabi Movement

اصلاح کے پیش نظر سب سے پہلی باقاعدہ تحریک سید احمد رائے بریلوی (1831-1786) نے شروع کی تھی جس کو عرف عام میں وہابی تحریک کہا جاتا ہے۔ اگر ہم تمام حالات کو نظر میں رکھیں اور عرب وہابیوں کے عقیدے اور رسم و رواج کے ساتھ اس کا موازنہ کریں تو اندازہ ہوگا اس تحریک کو وہابی کہنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ لیکن تحریک کے ساتھ یہ نام اس طرح وابستہ ہو گیا ہے کہ اب اس کو مسترد کرنے کا مطلب مزید غلط فہمیوں کو راہ دینا ہوگا۔ مزید برآں یہ ماننے کے بھی اسباب موجود ہیں کہ اپنے اپنے عقائد اور طرز عمل میں اختلافات کے باوجود ہندستانیوں کی تحریک عرب کے وہابیوں سے متاثر تھی۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ جب سید احمد حج کے لیے مکہ گئے تب تک وہاں سے وہابیوں کو نکال باہر کیا جا چکا تھا، لیکن یہ دلیل کچھ اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ بات تو درست ہے کہ اس وقت تک وہابیوں کی سیاسی قوت مکہ میں ختم ہو چکی تھی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہاں سے ان کا نظریاتی اثر بھی پوری طرح ختم ہو چکا تھا۔ اس تحریک کی نظریاتی بنیادوں میں وہابی اثرات بہ آسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اس تحریک کو وہابی تحریک کہنا غالباً درست نہیں ہے۔

ہندستان میں پنپنے والی وہابی تحریک کو کئی اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلوی (1760-1702) کی اصلاحی تحریک کا تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک نے شاہ ولی اللہ کی تحریک سے براہ راست اثر قبول کیا تھا۔ سید احمد، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں بزرگ شاہ ولی اللہ کے بیٹے اور ان کے خلیفہ تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ اور ان کے خلفاء نے دانش ورانہ سطح پر حالات کا مقابلہ کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ وہ یہ مانتے تھے کہ عالمانہ رہ نمائی کر کے مسلم معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ ان کے مقابلے میں سید احمد مرد میداں تھے اور ہتھیار بند ہو کر انھوں نے مسائل کے حل کی کوشش کیں۔ اس طرح سید احمد نے اپنے پیر و مرشد کے طریقے سے مختلف راستہ اختیار کیا۔ لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ سید احمد نے یہ تحریک ایک مذہبی اصلاحی تحریک کے طور پر شروع کی تھی اور اس میں قابل لحاظ کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ اپنے بعد کے دور میں اس تحریک نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف ایک مسلح جدوجہد کی شکل اختیار کر لی اور اس طرح اس کا کردار خاصا سیاسی ہو گیا۔ اس کے بعد بھی سید احمد کے پیروکاروں کا اصلاح معاشرہ کا جوش بغیر تھکے جاری رہا۔ یہ یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ ابتدا میں انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر جانے کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک پر انگریزوں کے قبضے کے بعد مسلمان جس ذلت اور زوال کا شکار ہوئے وہ اس سے بچنا چاہتے تھے۔ اگر شرعی احکام کے مطابق زندگی گزارنا کسی شخص کے لیے ناممکن ہو جائے تو کسی ایسے مقام پر ہجرت کر جانا اس پر واجب ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنے مذہب کی پابندی آزادی کے ساتھ کر سکے۔ لیکن سید احمد نے ہجرت کے مقابلے ان لوگوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا متبادل طریقہ اختیار کیا جو مسلمانوں کے ان حالات کے لیے ذمہ دار تھے۔ ان کا مقصد ان حالات کو بدل ڈالنا تھا۔

سید احمد 1786 میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پڑھنے لکھنے میں ان کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بڑے ہونے کے بعد انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور شاہ عبدالعزیز کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی چلے گئے۔ شاہ عبدالعزیز نے انھیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کی شاگردی میں دے دیا۔ سید احمد نے اپنی تعلیم میں کچھ خاص ترقی نہیں کی۔ اکیس برس کی عمر میں وہ شاہ عبدالعزیز کے نقش بندی سلسلے میں شامل ہو گئے اور چند برس تک ان سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ رائے بریلی چلے گئے اور دو برس وہاں قیام کیا۔ 1810 میں انھوں نے ٹونک کے نواب امیر خان کی فوج میں ملازمت کر لی اور چھے سال تک فن سپہ گری میں تربیت حاصل کی۔ 1816 میں وہ دہلی لوٹے اور اصلاح معاشرہ کی کوششیں شروع کر دیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عمومی بدحالی اور زوال کے تئیں وہ بے حد فکر

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad-32

مند تھے اور حالات کو بہتر بنانے اور اصلاح کے طریقوں پر غور کرتے رہتے تھے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سلسلے میں ان کی کوششیں صرف صوفیاء کے طریقے سے بارآور ہوسکتی ہیں۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ اس دور کے موجودہ حالات میں کسی اور طریقے کے مقابلے میں صوفی طریق ہی سب سے موثر ذریعہ ہوسکتا ہے۔ ان کی کوششوں کے جو نتائج برآمد ہوئے ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ایک بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب مولانا عبدالحئی (1828) نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا عبدالحئی شاہ عبدالعزیز کے داماد تھے اور بڑے مانے ہوئے عالم تھے۔ اس کے بعد شاہ محمد اسمٰعیل (1781-1831) ان کے حلقے میں داخل ہوئے، یہ شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے اور عالم کامل اور خطیب تھے۔ اندازہ ہے کہ اس واقعے نے مہمیز کا کام کیا اور جلد ہی شاہ ولی اللہ کے خاندان کے کئی اہم لوگ اور دوسرے ممتاز عالموں نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ اس سے ان کے مشن کو بڑی تقویت ملی اور انھوں نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے ارادے سے گرد و نواح کے علاقوں کا سفر شروع کیا۔ لوگوں کو مرید بنانے کے لیے انھوں نے دوسرے صوفیوں سے مختلف طریقہ اختیار کیا۔ اس دور میں ہندوستان میں چار قسم کے صوفی سلسلے عروج پر تھے۔ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقش بندیہ۔ وہ پہلے ان چاروں سلسلوں کی اپنے ہاتھ پر بیعت کراتے تھے اور آخر میں طریقۂ محمدی کی بیعت کراتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ طریقہ انھوں نے خود ایجاد کیا ہے اور اس میں شریعت کی پابندی پر زور دیا جاتا تھا۔ چاروں اہم صوفی سلسلوں کی بیعت کو یکجا کر کے وہ شاید ان سب سلسلوں کے پیروکاروں کو متحد کر کے اپنی تحریک کو وسعت دینا چاہتے تھے۔ کسی ایک ہی سلسلے سے وابستہ ہو کر رہ جانے سے دیگر سلسلوں کے لوگ ان کے ساتھ آنے میں پس و پیش کا شکار ہو سکتے تھے کیوں کہ اس سے ان کے اپنے مسلکوں کے تئیں وفاداری اور ارادت مندی کو مشکوک ٹھہرایا جا سکتا تھا جس سے بڑا مسئلہ پیدا ہوتا۔ سید احمد رائے بریلوی یہ مانتے تھے کہ مسلم معاشرے کی جو خرابیاں صوفی سلسلوں کے سبب وجود میں آئی ہیں ان کو دور کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ان خرابیوں کو دور کرنے کے مقصد کو نظر میں رکھ کر انھوں نے طریقۂ محمدی اختیار کیا جس میں روزمرہ کے معاملات میں قوانین شریعت کی پابندی کو مرکزی اہمیت دی گئی۔ ان قوانین کو اس تمام عرصے میں صوفی حلقے نظر انداز کرتے رہے تھے۔

مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی زندگی کی اصلاح کے لیے انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار اپنی کتاب ''صراط مستقیم'' میں کیا ہے۔ اس کتاب میں ان کے اقوال اور ملفوظات شامل ہیں۔ ان اقوال اور ملفوظات کو مولانا عبدالحئی اور شاہ اسمٰعیل نے مرتب کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ تحریک کے بارے میں ان کے نظریات پر مبنی ایک اور کتاب ''تقویۃ الایمان'' ہے جس کے مصنف شاہ اسمٰعیل ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں سید احمد کی اصلاحی تحریک کی بنیادی تعلیمات شامل ہیں۔ ان تعلیمات میں شریعت اور تصوف میں مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی شعوری کوشش ملتی ہے۔ اس میں ان بدعتوں، رسموں، رواجوں اور روایتوں سے بحث کی گئی جو وقت کے ساتھ مسلم معاشرے میں داخلِ زندگی ہوگئی تھیں یا جو دوسری قوموں سے رابطے، باطل تصوف اور دیگر اثرات کے تحت مسلم معاشرت کا حصہ بن گئی تھیں۔ دونوں ہی کتابوں میں توحید پر ایمان اور بلاشرکت غیرے خدا کی وحدانیت کو مرکزیت حاصل ہے۔ اسلام کے بنیادی ستون کی خلاف ورزی کرنے والے یا اس کی حیثیت سے مفاہمت کرنے والے تمام عقائد اور رسم و رواج کی شدید مذمت اس کتاب میں کی گئی ہے۔ ان بدعتوں میں زندہ یا مردہ پیروں کو غیر معمولی تعظیم، صوفیوں کے مزاروں پر حاضری دینا، ان کے مزاروں پر سر جھکانا اور ان کی پرستش کرنا، ان سے منت ماننا اور ان کے لیے نذر و نیاز دینا وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے بار بار زور دے کر بتایا کہ بندے اور خدا کے درمیان کوئی وسیلہ نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے تعزیہ داری اور اسی قسم کے دوسرے جلسے جلوسوں پر بھی سخت قسم کے اعتراض کیے جن کی نمو شیعہ مسلک کے زیر اثر ہوئی۔ مذہب میں ان بدعتوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ریت رواج مسلم معاشرے میں در آئے تھے۔ یہ رسمیں نہ صرف سماجی برائیوں کے زمرے میں آتی ہیں بلکہ انھوں نے مذہب کی حدود کو بھی توڑا۔ ان میں سے بہت سی رسمیں اصراف بے جا کی حامل اور لغو بتائی گئی ہیں۔ اس قسم کی رسمیں شادی بیاہ، اور عقیقے کی تقریبات اور تکفین و تدفین کی رسومات سے متعلق ہیں۔ اس سے قبل ایسے طور طریقے رائج تھے جو مسلم معاشرے کی روح کو مجروح کر رہے تھے اور اس کی مذہبی، اخلاقی اور سماجی جڑوں کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ 'صراط مستقیم' اور 'تقویۃ الایمان' میں نہ صرف یہ کہ ان بدعتوں اور طور طریقوں کی نشان دہی کی گئی ہے بلکہ ان کو دور کرنے اور اصلاح کی وکالت بڑے پرزور طریقے سے کی گئی ہے۔ سیاسی محاذ پر حالانکہ اس تحریک کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن مذہبی اور سماجی اصلاح کے محاذ پر اس نے خاصی کامیابی حاصل کی۔ اگر اس کی توجہ کا مرکز سیاسی حلقہ نہ ہوتا تو شاید اس نے بے مثال کامیابی حاصل کی ہوتی جس کا سبب یہ تھا کہ اس کے رہ نما کی شخصیت مقناطیسی تھی اور جتنی بڑی تعداد میں لوگ ان کی جانب کھنچے چلے آئے تھے اس سے ان کے اصلاحی افکار کو زیادہ فروغ مل سکتا تھا۔

1821 میں سید احمد حج بیت اللہ کو گئے اور 1823 میں واپس لوٹے۔ حج سے لوٹ کر انھوں نے جلد ہی سکھوں اور انگریزوں کے خلاف مسلح جدو جہد شروع کر دی۔ سکھوں کی فوج کے خلاف بالاکوٹ میں جنگ کرتے ہوئے وہ بالآخر 1831 کے اوائل میں شہید ہو گئے۔ جس بہادری کے ساتھ انھوں نے انگریزوں کی مزاحمت کی تھی اس کی حدت نے ہندوستان کی آئندہ نسلوں کو ایک طویل عرصے تک گرمائے رکھا۔ یہاں یاد دلانا ضروری ہے کہ سید احمد کی شہادت کے بعد ان کے بہت سے مریدوں نے مختلف علاقوں میں اصلاحی تحریک کو جاری رکھا۔ مثلاً مولانا عنایت علی نے اپنے اصلاحی کاموں سے بنگال کے مسلم معاشرے پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ مزید برآں، بعد میں یہ تحریک اہل حدیث کی تحریک کے نام سے بھی معروف ہوئی جس کے تحت علم احادیث کے احیاء پر تو زور دیا ہی گیا ساتھ ہی اس تحریک نے مذہبی اصلاح کے میدان میں بھی بڑی خدمات انجام دیں۔ اہل حدیث تحریک کی شروعات کا سہرا بھی سید احمد کے شاہ اسمٰعیل جیسے پیروکاروں کے سر بندھا ہے جو غالباً عرب کی وہابی تحریک سے متاثر تھے۔ شاہ اسمٰعیل اور سید احمد کے دوسرے شاگردوں نے کسی ایک مسلک کی پیروی کو یکسر مسترد کر دیا اور ایسی مذہب کی تشریحات کو ماننے سے انکار کر دیا جن کے بارے میں ان کو یقین تھا کہ وہ قرآن اور احادیث کے احکامات کے خلاف ہیں۔ شرعی قوانین کے استناد کو مسترد کرتے ہوئے انھوں نے مذہبی مآخذ سے براہ راست استفادے کی ضرورت پر زور دیا۔ ان لوگوں کو 'غیر مقلدین' کا خطاب دیا گیا۔ نواب صدیق حسن خان (1890-1832) اور مولانا نذیر حسین (م 1902) اس تحریک کے رہنما اور روشن مینار تھے۔ مذہبی اصلاحات اور حدیثوں کی تعلیم و تعلم کے فروغ میں ان کی نمایاں خدمات ہیں۔ یہ تحریک بنیادی طور پر شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے متاثر تھی لیکن ان کے پیروکاروں نے شاہ ولی اللہ کی اعتدال پسندی اور مفاہمت کے جوہر کو نظر انداز کر دیا۔ ایسے معاملات میں جن کو اسلام کا بنیادی ستون نہیں کہا جا سکتا ان کے شدت پسندانہ موقف نے ایسے حالات پیدا کر دیے جن کو اسلام کے اندر ایک اور علاحدہ مسلک کی نمود سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

26.3 فرائضی تحریک Faraizi Movement

سید احمد کی تحریک کا کردار تو ملک گیر تھا لیکن ایک اور تحریک فرائضی تحریک نام کی تھی جو صوبۂ بنگال تک محدود تھی۔ 1818 میں شروع ہونے والی اس تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ (1840-1781) تھے۔ وہ فرید پور ضلع کے بندر کھولا کے ایک غیر معروف خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ حج کے لیے پہلی بار مکہ گئے اور اپنے دو بار کے سفر میں انھوں نے وہاں بیس برس قیام کیا۔ مکہ کے ایک مشہور عالم شیخ طاہر سومبل مکی جیسے بزرگوں کے قدموں میں انھوں نے تعلیم پائی۔ 1802 میں حاجی شریعت اللہ اپنے پہلے سفر سے واپس ہندوستان لوٹے۔ جب وہ دوسری بار مکہ کے لیے عازم سفر ہوئے تو مکہ میں وہابیوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، اس لیے مکہ پہنچ کر وہابیوں کے نظریات سے ان کا واسطہ پڑا۔ وہابی تحریک عرب میں محمد بن عبدالوہاب 1792-1703 نے شروع کی تھی۔ وہ عرب کے نجد کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اپنی تعلیم کے دوران وہ عظیم اسلامی مفکر، عالم اور مصلح ابن تیمیہ (1328-1263) کے افکار سے بہت متاثر ہوئے اور اسی کے زیر اثر وہ معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کے جوش و جذبے سے مغلوب ہو گئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے زوال اور بدعتوں سے نالاں ہو کر انھوں نے ایک زبردست اصلاحی تحریک شروع کی اور مسلمانوں کو اسلام کے ابتدائی دور کے تقدس اور تقویٰ کی جانب لوٹنے کی دعوت دی۔ وہابی تحریک نے نہ صرف عرب کے مسلمانوں کو شدید طور پر متاثر کیا بلکہ دور دراز کے ممالک میں بھی اس کے اثرات ان لوگوں کی وجہ سے محسوس کیے گئے جو ان ممالک سے مکہ میں اعلا تعلیم کے لیے یا حج کے لیے آتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حاجی شریعت اللہ بھی اس تحریک کے اثر میں اس وقت آئے جب انھوں نے مکۃ المکرّمہ میں طویل عرصے تک قیام کیا اور جب وہ اپنے وطن کو لوٹے تو اصلاح معاشرہ کا جوش ان کے دل میں موجیں مار رہا تھا۔ بنگال کے مسلمانوں کے حالات سے ان کے عزم کو مزید تقویت ملی۔

فرائضی تحریک کے ابتدائی نقوش انیس ویں صدی کے ربع اول میں بنگال کے علاقے کے مذہبی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی حالات میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مسئلے کی سنجیدگی کی شدت کا اندازہ اس دور کے ایک برطانوی مصنف کے اس مشاہدے سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنگال کے مسلمان صرف نام کے ہی مسلمان تھے۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ ربط ضبط کے باعث انھوں نے ایسے بہت سے طور طریقے، ریت رواج اور مذہبی رسمیں اختیار کر لی تھیں جن میں سے کچھ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے براہ راست متصادم تھیں۔ وہ سورج، چاند اور آگ کی پرستش کرتے تھے اور ہولی، دیوالی، دسہرا، شوراتری اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے تہوار اپنے ہمسایوں کی مانند ہی مناتے تھے۔ وہ جہیز لیتے اور دیتے تھے اور بیواؤں کی شادی پر ناک بھوں سکیڑتے تھے۔ رقص،

موسیقی اور شراب نوشی ان کے تہواروں کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ تصوف جس نے بنگال کے مسلم معاشرے کی بنیاد رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا، اب زوال پذیر ہو چکا تھا اور بہت سے عیوب کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ ذات پات کے ہندو نظام کے زیر اثر بنگال کے مسلمان بھی بہت سے سماجی طبقوں میں بٹ چکے تھے اور مساوات اور عالمی بھائی چارے کے اسلامی مقاصد کو وہ ترک کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے نام نہاد اعلا طبقے کے لوگ کسی بھی نچلے طبقے کے مسلمان سے نہیں ملتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے ہاں چھوا چھوت کے بھی نشان تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح ان کے سیاسی اور معاشی حالات بھی تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہے تھے۔ بنگال کو کسی زمانے میں سب سے زیادہ خوش حال اور ترقی یافتہ صوبہ سمجھا جاتا تھا لیکن برطانوی سامراج کے قابض ہونے کے بعد یہ پوری طرح تباہ کر دیا گیا اور اس کی خوش حالی اور دولت گزرے دنوں کی کہانی بن کر رہ گئی۔ کوئی سرپرستی حاصل نہ ہونے کے سبب ان کے ہاں پیداوار میں زبردست گراوٹ آئی اور برطانوی پالیسی کے تحت ان کی معیشت کو ٹھپ کر دیا گیا۔ ماضی کے خوش حال اور متمول دست کار اور صنعت کار بالکل کنگال کر دیے گئے۔ مالگزاری میں زبردست اضافہ کیا گیا اور محصول کے لیے سخت جبر اور تشدد کے طریقے اپنائے گئے۔ اس سے کسان پوری طرح برباد ہو گئے۔ اغلب ہے کہ یہ صورت حال حاجی شریعت اللہ کے ذہن پر ضرور دباؤ ڈالے ہوئے ہوگی اور اسی وجہ سے اس پس منظر میں انھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی تحریک شروع کی ہوگی۔

فرائضی تحریک کے کئی پہلو ہیں۔ اس کو مذہبی اصلاحی تحریک بھی کہا جاتا ہے، کسان تحریک بھی، طبقاتی جدوجہد بھی اور بنگال کے عوام کی سماجی معاشی ترقی کی تحریک بھی۔ پھر بھی اگر ہم تمام صورت حال کو نظر میں رکھیں تو اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ یہ بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی۔ تحریک کے نام سے بھی واضح طور پر یہی اندازہ ہوتا ہے۔ تحریک میں شامل لوگ خود کو فرائضی کہتے تھے، یعنی اسلام کے بتائے ہوئے مذہبی فریضوں پر سختی سے عمل کرنے والے لوگ۔ جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا ہے، بنگالی مسلم معاشرے میں اصلاحات لانے کی تحریک عرب کی وہابی تحریک سے ملی تھی۔ حاجی شریعت اللہ کی زندگی میں فرائضی لوگوں نے اپنا دائرۂ عمل صرف مذہبی اصلاحات تک محدود رکھا تھا۔ لیکن بعد کے دور میں ان کے بیٹے دودو میاں کی رہ نمائی میں تحریک نے اپنا دائرۂ کار معاشی اور سیاسی معاملات تک بڑھا لیا۔ تحریک کی پالیسی میں اس تبدیلی کے اسباب کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جن لوگوں کے درمیان تحریک کے لوگ کام کر رہے تھے اور اصلاحات چاہتے تھے ان لوگوں کے حالات مایوس کن حد تک پست تھے۔ وہ انتہائی غریب اور انتہا درجے کے استحصال کا شکار لوگ تھے۔ تحریک کے لوگ عوام کی اس بدحالی اور ذلت کے خاموش تماشائی کیونکر بنے رہ سکتے تھے۔ ان کے مادی حالات بہتر بنانے کی فکر میں اور ان کو ایک باعزت زندگی دینے کے جوش میں تحریک میں شامل لوگوں کو زمینداروں، نیل کی کھیتی کے تاجروں اور حکومت کے خلاف صف آرا کر دیا۔ کسانوں اور بنکروں کی مشکلوں کو حل کرنے اور ان کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے شروع کی گئی جدوجہد بڑی سخت اور طویل تھی لیکن اس کے نتائج بھی بڑے ثمر آفریں تھے۔ اس نے بنگال کا چہرہ ہی بدل دیا۔ ان بڑی کامیابیوں کے باوجود جو تہذیب، سیاست اور معیشت کے میدانوں میں حاصل ہوئیں، تحریک کا مرکزِ نگاہ بنگال کے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح ہی بنا رہا۔

تحریک کی نظریاتی بنیاد رضاے خداوندی کی مکمل اطاعت نے فراہم کی۔ قرآن، سنت اور اسلام کے ابتدائی دور کی روایات رضاے خداوندی کے مآخذ ہیں۔ وہ یہ مانتے تھے کہ قوم کی مذہبی اور روحانی ضرورتوں کے لیے قرآن ایک کامل رہ نما ہے، اسی لیے انھوں نے قرآن کے متن پر ہی تحریک کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے پیغمبر اسلام کی سنت کو بھی مکمل اہمیت دی اور پورے صدقِ دل سے ان کی پیروی کی۔ انھوں نے ان تمام طور طریقوں اور رسموں کو مسترد کر دیا جن کی توثیق ان ماخذ سے نہیں ہوتی۔ شریعت کے معاملے میں انھوں نے حنفی مسلک کو قبول کیا لیکن دوسرے مسالک کے تئیں ان کا رویہ رواداری اور معروضیت پر مبنی تھا۔ تمام مسالک کو یہ لوگ درست مانتے تھے۔ انھوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں پر کاربند ہونے کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ پابندی سے نماز نہ پڑھنے والے کی نماز جنازہ میں یہ لوگ شرکت نہ کرتے تھے۔ اسی سخت اصول پر کاربند ہونے کی وجہ سے اس تحریک کے کارکنان کو 'خارجی' کا لقب بھی ملا۔ انھوں نے خدا کے لاشریک ہونے اور توحید کے ایک واضح معنی پر بہت زیادہ زور دیا۔ توحید کے اس وقت کے مروجہ معنی کو انھوں نے رد کر دیا کیونکہ اس میں بنگال کے مسلمانوں میں رائج کئی دوسرے طور طریقوں کو شامل کرنے کی گنجائش تھی جبکہ یہ طور طریقے اسلام کی روح کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک اللہ کی ذات پر اعتقاد رکھنے کو کافی نہیں کہا جا سکتا تھا جب تک کہ اس اعتقاد کے ساتھ توحید کے اسلامی نظریے پر بھی اعتقاد نہ ہو جس کے مطابق خدا کا کوئی ہم سر یا ساتھی نہیں ہے۔ یعنی وحدہٗ لاشریک لہٗ پر مکمل ایمان ہونا اسلام کا بنیادی ستون ہے۔ خدا کی اس خالص وحدانیت میں کفر، شرک اور بدعت

کے ہلکے سے شائبے تک کو روا نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تحریک دراصل سادہ عادات واطوار اور قرآن کی وحدانیت کے پیغام کی طرف لوٹنے کی تحریک تھی۔ جو شے بھی اس بنیادی اصول کے خلاف تھی اس کو غیر اسلامی قرار دے دیا جاتا تھا۔ انھوں نے خالص وحدانیت پر زور دیتے ہوئے صوفیاء، ملائکہ اور ارواح کی مداخلت اور وسیلے کو پوری طرح مسترد کیا۔

یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ حاجی شریعت اللہ کو بنگال کے مسلم معاشرے کی اصلاح کی تحریک غالباً عرب کے وہابیوں سے ملی جن کے اثرات کے نشان ان کی تعلیمات پر واضح طور پر پہچانے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک پہلو ایسا بھی ہے جو وہابیوں کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ وہابیوں کے لیے تصوف اور صوفیانہ طور طریقے پوری طرح ناقابل قبول تھے۔ لیکن فرائضی لوگوں نے کئی صوفی طور طریقوں کو اپنے پروگرام میں شامل رکھا اور ان کا استعمال اصلاح کے لیے کیا۔ حاجی شریعت اللہ نے مکہ میں خود اپنے استاد طاہر سومبل سے بیعت کی تھی اور سلسلۂ قادریہ میں داخل ہو گئے تھے۔ انھوں نے خود بھی اپنے بہت سے مرید بنائے، حالانکہ اپنی زندگی میں انھوں نے اس رشتے کو کبھی پیری مریدی کا رشتہ نہیں کہا جبکہ یہ رشتہ پیری مریدی کا تھا۔ اس کو انھوں نے استاد شاگرد کے رشتے سے منسوب کیا۔ لیکن ایسا کرنے سے یہ حقیقت نہیں بدلی کہ یہ دراصل قدیم صوفی روایت ہی کا اتباع تھا جس کو ایک نیا نام دے دیا گیا تھا۔ یہ تمام کسرت اس وقت بے کار ہو گئی جب بعد میں حاجی شریعت اللہ کے بعد میں آنے والوں نے اس طریقے کو ترک کر کے پرانی روایت کو پھر سے اختیار کرتے ہوئے اس رشتے کو پیری مریدی ہی کا نام دیا۔ اصلاح کے عمومی فریم ورک میں اس طرح کے اقدام کو غیر مستقل ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ بنگالی مسلم معاشرے کی بیشتر خرابیوں کا منبع یہی صوفی روایت تھی۔ فرائضی رویے کے اس ظاہری تضاد کے لیے دو ممکنہ توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ حاجی شریعت اللہ نے اپنے استاد شیخ طاہر سومبل کے اثرات قبول کرتے ہوئے تصوف کو اپنے اصلاحی پروگرام کا حصہ بنایا۔ اس سے بھی زیادہ قابل قبول جواز یہ ہو سکتا ہے کہ بنگالی مسلم معاشرے کی زمینی حقیقتوں کا ادراک کر کے انھیں یہ ضروری محسوس ہوا کہ تصوف کو ایک آلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود کہ تصوف میں بہت سی خرابیاں داخل ہو چکی تھیں، اس نے بنگال کی اسلامی تاریخ میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ آج بھی بنگال کے مسلمانوں پر اس کے نمایاں اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صوفیا عام لوگوں کو جتنی شدت کے ساتھ متاثر کرتے ہیں اتنا شدید اثر دوسرے مذہبی رہنما ان پر نہیں ڈال سکے۔ اپنے پیر کی بات کو لوگ بے چون و چرا تسلیم کرتے ہیں اور کبھی کوئی سوال نہیں اٹھاتے۔ صوفی روایت کے ضابطے کا یہ ایک لازمی اصول ہے۔ ممکن ہے کہ حاجی شریعت اللہ کو یہ لگا ہو کہ اصلاح معاشرہ کے اپنے مقاصد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے تصوف بہترین وسیلہ ثابت ہوگا۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ شیخ طاہر سومبل کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلسلہ قادریہ میں شامل ہوئے ہوں گے تاکہ اپنے اصلاحی پروگرام میں پیری مریدی کو شامل کر کے اس کا مثبت استعمال کر سکیں۔ عرب کے وہابیوں کے ساتھ اپنے روابط کے باوجود انھوں نے تصوف کو قبول کیا لیکن ساتھ ہی توحید پر مسلسل اصرار کرتے رہے اور اس کے لیے کسی بھی قیمت پر کسی قسم کی مفاہمت کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ بنگال کے طریق تصوف میں جو خرابیاں آئی تھیں ان میں بھی حاجی شریعت اللہ نے بہت سی اصلاحات کیں۔ مثلاً انھوں نے بیعت کے طریقے کو بدلا۔ سب جانتے ہیں کہ بیعت کے ذریعے ایک نو وارد تصوف کی پراسرار دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ بیعت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ پیر نے اس نو وارد کی تربیت اور راہ نمائی کی ذمے داری قبول کر لی جس نے پیر کی روحانی بالادستی کو تسلیم کیا ہے۔ بیعت کا طریقہ یہ ہے کہ شاگرد اپنے پیر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر علامتی طور پر اس کی روحانی سرپرستی کو قبول کرتا ہے اور اس وقت پیر کے کہے ہوئے الفاظ کو دہراتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے پیغمبر نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا اور صوفیاء کرام کا یہ دعوا ہے کہ بیعت کی تجدید کر کے ہم صرف سنت رسول اللہ کا اتباع کر رہے ہیں۔ لیکن حاجی شریعت اللہ کا خیال تھا کہ چونکہ یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ رسول اللہ نے ایسا کیا تھا اس لیے اسلام میں یہ بدعت ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے بیعت کے طریقے کو رد کر دیا۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ نو وارد اپنے گذشتہ گناہ کے لیے توبہ کریں اور مستقبل میں تقوے کی زندگی گزارنے کا مصمم ارادہ کریں۔ نو وارد اپنے پیر کے سامنے بیٹھ کر یہ الفاظ دہراتا تھا: ''شرک، بدعت، خدا کی نافرمانی، ناانصافی، ظلم و جبر کے جو گناہ میں نے جانے انجانے میں کیے ہیں ان پر شرمندہ ہوں اور میں قصد کرتا ہوں کہ میں توحید کے راستے پر چلتا رہوں گا اور اس کے احکامات کی حتی المقدور پابندی کروں گا اور اپنی زندگی رسول اللہ کی سنت کے مطابق گزاروں گا''۔ لفظ ''توبہ'' میں اس تحریک کی روح مضمر تھی۔ مزید برآں شاگردوں کو یہ جملہ عربی کے بجائے بنگالی زبان میں دہرانا ہوتا تھا جبکہ صوفیاء کے ہاں عام رواج عربی میں دہرانے کا تھا۔ پیر اور مرید کو بدل کر استاد اور شاگرد میں بدلنے کی بات پر تو کوئی اعتراض نہیں کیا گیا لیکن بیعت کے طریقے میں تبدیلی کی خاصی شدید مخالفت ہوئی اور ناراضگی کا ماحول پیدا ہوا۔

حاجی شریعت اللہ خود تو قادری سلسلے سے بیعت تھے لیکن ان کے بعد آنے والے فرائضی لوگ چشتی، مجددی اور نقش بندی سلسلوں میں بھی داخل ہوئے۔ ان لوگوں نے البتہ سہروردی سلسلۂ تصوف سے کوئی علاقہ نہیں رکھا، حالانکہ یہ سلسلہ بنگال میں مسلمانوں کی آمد سے ہی بڑا مقبول عام سلسلہ رہا ہے۔ ایسا کیوں ہوا، اس کے اسباب کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

اس دور کا بنگالی مسلم معاشرہ ہر قسم کی توجیہات اور بدعتوں کا شکار تھا۔ اس کے مختلف اسباب تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، برطانوی مصنفین بھی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہاں کے مسلمان صرف نام کے ہی مسلمان ہیں۔ کسی قسم کی تبدیلی لانے کے لیے ان تمام حالات کو بدلنا ضروری تھا۔ حاجی شریعت اللہ نے بڑی سختی کے ساتھ ان طور طریقوں، رسموں، رواجوں اور تقریبوں وغیرہ کی شدید مذمت کی جن میں شرک، مقدس لوگوں کے مزاروں پر قربانیاں دینا، صوفیاء کے مزاروں پر چڑھاوا چڑھانا، فاتحہ کی تقریبوں کا اہتمام کرنا، رقص و موسیقی، دُرگا اور کالی دیوی کی پرستش اور اسی قسم کی دیگر خرابیاں شامل تھیں۔ ان برائیوں کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے حاجی شریعت اللہ نے ان تھک کوششیں کیں اور ان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

اخلاقیات اور تہذیب چونکہ کسی بھی قوم کے عقائد کے سب سے واضح مظاہر ہوتے ہیں اس لیے بنگالی مسلمانوں کے تہذیبی پہلو کی طرف بھی حاجی شریعت اللہ نے توجہ دی۔ غریب کسانوں اور بنکروں کی تعلیم و تربیت کے لیے شعوری کوششیں کی گئیں۔ فرائضی تحریک سے وابستہ لوگوں میں اکثریت انھی طبقوں کی تھی۔ نیل کے کاشتکاروں اور حکومت کے ہاتھوں وہ جس طرح استحصال اور ذلت کی زندگی گزار رہے تھے اس نے ان میں عزت نفس، خود اعتمادی، تہذیبی جڑوں کے احساس اور تشخص کے ادراک کی کوئی نشانی ان میں باقی نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا سہرا فرائضی تحریک کے سر بندھتا ہے کہ اس نے ان دبے کچلے لوگوں میں مقصدیت کا ایک نیا ادراک پیدا کیا اور زندگیوں کو ڈھالنے کے لیے ایک نئی قوت اور نئی روح ان میں پھونکی۔ ان کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فرائضی ایک مخصوص شناخت کے حامل ہو گئے جس سے لوگ انھیں فوراً پہچان لیتے تھے۔ اس تحریک نے ان لوگوں کو وہ توقیر اور خود اعتمادی عطا کی جو اس سے قبل ان میں مفقود تھی۔

بنگال کے مسلم معاشرے میں پھیلی بہت سی سماجی برائیاں بھی تھیں جن کی طرف فرائضی تحریک کے لوگوں نے فوری توجہ دی۔ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ ایک طویل دور کے ربط ضبط کے سبب مسلمانوں نے بھی ان کی طرح ذات پات کی پابندی کے سارے طور طریقے پوری طرح سے اختیار کر رکھے تھے۔ یہاں تک کہ چھوا چھوت کی نشان دہی بھی ان کے یہاں کی جا سکتی تھی۔ وہ بھی شریف اور رذیل ذاتوں اور طبقوں میں تقسیم تھے اور ایک دوسرے کے ہاں شادیاں نہیں کرتے تھے، بلکہ ساتھ بیٹھ کر کھانا تک نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے پیشہ جات ہی نے ذات کی شکل اختیار کر لی تھی۔، ہر گروہ اور طبقے کی کوششیں اپنی علاحدہ شناخت کو محفوظ رکھنے کی ہوتی ہے۔ یہ طور طریقے اسلام کی تعلیمات کے یکسر خلاف تھے، کیونکہ اسلام نے تمام عالم انسانیت کو برابری کا درجہ دیا ہے اور پیشے کی بنیاد پر تفریق غیر اسلامی ہے۔ حاجی شریعت اللہ نے اس سماجی برائی کو مسلم معاشرے سے ختم کرنے کی طرف توجہ دی اور فرائضی تحریک کے اثرات والے علاقوں سے اس کو پوری طرح ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ذات پات کی بندشوں میں جکڑے بنگالی معاشرے میں یہ تبدیلی کسی انقلاب سے ہرگز کم نہ تھی اسی لیے لوگ جوق در جوق اس تحریک سے وابستہ ہونے لگے۔ جن لوگوں نے بھی فرائضی تحریک کا مطالعہ کیا اور اس پر لکھا ہے وہ اس پر متفق ہیں کہ فرائضی لوگ اپنے دائرے میں مکمل برابری لانے میں پوری طرح کامیاب ہو گئے تھے۔

تہذیبی اصلاح کے ایک جزو کے طور پر فرائضی مصلحین زبان کے معاملات کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ اس علاقے میں مسلم حکمرانی کے دور سے ہی عربی اور فارسی مذہبی معاملات کی زبانیں بنی ہوئی تھیں۔ بعد میں ان زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو بھی اسلامی تعلیم کے لیے استعمال کی جانے لگی تھی۔ بنگالی مسلمانوں کی ناخواندہ اکثریت کے لیے یہ زبانیں ناقابل فہم تھیں۔ خود سے مخاطب کسی عالم کی قوت گفتار اور علم کی گہرائی سے وہ مرعوب ہو سکتے تھے، اس کی عزت کر سکتے تھے لیکن ان کی باتوں سے کسی طرح فیض یاب نہ ہو سکتے تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے اپنی تحریک کو پھیلانے کا کام بنگالی زبان سے لیا اور اس کے بڑے وقیع نتائج برآمد ہوئے۔ ان کی باتیں نہ صرف یہ کہ لوگوں کو پوری طرح سمجھ میں آتی تھیں بلکہ یہ تحریک بنگالی زبان کی ترقی میں بھی معاون ہوئی۔ فرائضی تحریک کے لوگوں نے البتہ عربی زبان کی تعلیم کو اس کے ساتھ ساتھ لازمی قرار دیا کیوں کہ عربی قرآن کی زبان ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بنیادی طور پر فرائضی تحریک ایک مذہبی اصلاحی تحریک تھی لیکن بنگال میں مسلمانوں کے جو حالات تھے ان کے سبب تحریک کو اپنی توجہ معاشی اور سیاسی حالات کی جانب بھی مبذول کرنی پڑی۔ اس کی وجہ سے کچھ عالموں نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ فرائضی تحریک دراصل میں ایک کسان تحریک

تھی اور طبقاتی جدو جہد اس میں شامل تھی لیکن یہ دلیل اس موضوع پر موجود شواہد سے کہیں ثابت نہیں ہوتی۔ اگر ہم پوری صورت حال کو نظر میں رکھیں تو صاف محسوس ہو جائے گا کہ سماجی اور معاشی میدانوں میں تحریک کی دل چسپی صرف حالات کی پروردہ تھی۔ اسی وجہ سے جب وہ ایک بار ان حالات کا حصہ بن گئی تو خود کو اس سے باہر لانا اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ اس طرح بنگال کی سماجی معاشی زندگی کا کردار بننا اس کے لیے ناگریز ہو گیا اور اس کے اثرات آئندہ طویل عرصے تک برقرار رہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس تحریک کے تحت معاشی فلسفے کی بنیادیں قرآن کی تعلیم اور سنت و احادیث میں پیوست ہیں۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے مذہب کے دائرے میں رہ کر حلال روزی پر زور دیا۔ سود کے لین دین، ذخیرہ اندوزی اور ایسے ذرائع آمدنی جن کو اسلام حرام قرار دیتا ہے، مکمل طور پر رد کیے گئے کیونکہ وہ یہ مانتے تھے کہ صرف انھی لوگوں کی عبادت قبول ہوتی ہے جو ایمانداری سے روزی کماتے ہیں۔ انھوں نے تکریم محنت پر بے حد زور دیا۔ اس نے معاشرے کے دبے کچلے طبقوں میں عزت نفس کے احساس اور خود اعتمادی پیدا کرنے میں بڑا تعاون دیا۔ اس تحریک نے اخوت و مساوات کے اصولوں کو عملاً نافذ کر کے دکھایا۔ اصول کے مطابق وہ سب سے غریب اور سب سے کمزور شخص کی مدد بھی اسی طرح سے کرتے تھے جس طرح سب سے امیر اور سب سے طاقت ور کسی شخص کی کر سکتے تھے۔ ذات پات کے نظام کے شکار بنگالی مسلم معاشرے میں یہ تبدیلی کوئی چھوٹی کامیابی نہ تھی۔

فرائضی لوگوں کے سیاسی نظریات ہماری بحث کے دائرے میں شامل نہیں حالانکہ موجود شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ انگریزوں کے مخالف تھے اور مسلم حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کے کئی سیاسی نظریے ان کے مذہبی اعتقادات کے بے حد نزدیک تھے اور مذہبی فرائض کی ادائیگی پر بھی ان کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ کہ انگریزوں کی حکومت میں ہندوستان کو انھوں نے دارالحرب قرار دیا اور اس بنا پر یہ کہا کہ جمعے کی نماز اور عید کی دوگانہ نمازیں یہاں شرعاً پڑھی نہیں جا سکتیں۔ انھوں نے یہ دونوں نمازیں پڑھنی چھوڑ دیں جو آزادی ملنے کے بعد ہی پھر سے شروع کی گئیں۔ ان سے قبل شاہ عبدالعزیز دہلوی نے برطانوی حکومت کے تحت ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا لیکن انھوں نے یہ انتہائی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ جمعے اور عید کی دونوں نمازوں پر پابندی کی بات کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ یہ مانتے تھے کہ انگریزی حکومت کے تحت وہ نارمل مذہبی زندگی گزارنے کو آزاد نہ تھے اور اسی لیے اس سیاسی صورت حال کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نکلتا ہے کہ وہ دارالاسلام کے طور پر ہندوستان کی گزشتہ حیثیت کو پھر سے قائم کرنا چاہتے تھے جس کے معنی تھے مسلم حکومت کا قیام — جیسا کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے تھا، اور تبھی وہ نارمل مذہبی زندگی کی طرف واپس لوٹ سکتے تھے۔ اس اقدام کی سیاسی معنویت کو کوئی بہ مشکل ہی نظر انداز کرے گا۔ صرف جہاد کا اعلان کرنے کی کسر رہ گئی تھی ورنہ فرائضی تو برطانیہ کے زیر حکومت ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے جس کا ایک مطلب تقریباً اعلانِ جہاد تھا۔ اسی طرح حاجی شریعت اللہ نے اپنے پیروکاروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ زمینداروں اور حکومت کو کسی بھی قسم کا ٹیکس ادا نہ کریں۔ یہ ممانعت بھی ان کے اسی فلسفے کا نتیجہ تھی۔ مزید برآں، خاص محلوں پر قبضہ اور گاؤں کی سطح پر پنچایتوں کے قیام کو بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے کیونکہ یہ پنچایتی نظام مقامی سطح پر باہمی قضیوں میں برطانوی نظامِ عدلیہ سے اجتناب برتنے کی غرض سے نافذ کیا گیا تھا۔

اپنی تنظیم کی کارکردگی پر نظر رکھنے کے لیے اور اس کی پالیسیوں کے بہترین نفاذ کے لیے فرائضیوں نے ایک بہت بڑا نیٹ ورک قائم کر لیا تھا جس کو 'خلافت' نظام کہتے تھے۔ لگتا یہ ہے کہ حاجی شریعت اللہ کو اس قسم کی تنظیم و تربیت کی ضرورت کا احساس تو تھا لیکن ان کے پاس اس کام کے لیے وقت نہ تھا۔ لہٰذا ان کے بیٹے اور وارث دودو میاں پر یہ ذمے داری آئی کہ وہ اس سلسلے میں کام کو آگے بڑھائیں۔ حاجی شریعت اللہ نے البتہ لٹھیتوں کا ایک گروہ ضرور تیار کیا تھا جس کو لٹھیال کہا جاتا تھا۔ اس گروہ کا کام کسانوں اور بنکروں کے مفادات کی حفاظت کرنا تھا۔ خلافت نظام جس کی بنیاد بعد میں دودو میاں نے ڈالی، ایک بڑا وسیع و وقیع نظام تھا جس میں فرائضیوں کے تسلط والے تمام علاقے کو گاؤں، اکائیوں اور حلقوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ہر سطح پر ایک ایک خلیفہ کا تقرر کیا گیا تھا اور اس طرح ایک قسم کی زمرہ بندی قائم کی۔ اس درجہ بندی میں بلند ترین مقام دودو میاں کو حاصل تھا جن کو لوگ استاد کہتے تھے اور سب سے نچلے درجے پر گاؤں کا خلیفہ ہوتا تھا۔ خلیفہ کی ذمے داریوں میں یہ بات شامل تھی کہ وہ اسلام کے بنیادی احکامات کے بارے میں اپنے پیروکاروں کو تعلیم دے، مسجدیں تعمیر کرائے اور اماموں کا تقرر کرے، شادی بیاہ اور موت سے متعلق معاملات دیکھے، مکتب قائم کرے، شادی اور وراثت سے متعلق قضیے نمٹائے اور لوگوں کے باہمی جھگڑوں میں بھی ثالثی کرے۔ ان مختلف النوع ذمے داریوں کے نباہ میں مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ یونٹ یا اکائی کی پیداوار کا دسواں حصہ معاوضے کے طور پر حاصل کرتے تھے۔ مختلف خلفاء کے فرائض اور ذمے داریاں واضح طور پر منقسم تھیں۔ مرکز اور

مختلف خلفاء کے مابین رابطے کے لیے انھوں نے پیغام رسانی کا ایک بڑا کارگر نظام بنا رکھا تھا۔ خلافت نظام کے ذریعے ہی فرانسیسی تحریک کے رہ نماؤں نے اپنے اثر والے تمام علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر رکھا تھا اور اسی کی بدولت وہ مختلف علاقوں میں رونما ہونے والے واقعات اور بدلتے حالات کی پوری خبر رکھتے تھے۔

26.4 دیوبند تحریک Deoband Movement

دیوبند اتر پردیش کے سہارن پور ضلع کا ایک قصبہ ہے جو دلی سے تقریباً نوے میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی مقام پر دارالعلوم کی بنیاد ڈالی گئی اور اس نے ملک اور مسلم فرقے کی تاریخ میں آگے چل کر ایک اہم رول ادا کیا۔ ایک چھوٹا سا مکتب قصبے کی جامع مسجد (جسے چھتا مسجد کہتے تھے) میں چلتا تھا۔ 1867 میں اس مکتب کو ایک اعلا تعلیمی ادارے کی حیثیت دی گئی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی (1832-1880) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (1826-1905) جنھوں نے اس تحریک کو شروع کیا، شاہ ولی اللہ کے دبستان سے فارغ تھے۔ ان کا دانش ورانہ سلسلہ کئی معنوں میں شاہ ولی اللہ سے جا ملتا تھا۔ ان دونوں ہی نے حدیث کی تعلیم مولانا احمد علی سہارن پوری اور مولانا عبدالغنی نقش بندی کے قدموں میں حاصل کی جو شاہ محمد اسحاق (1778-1875) کے شاگردان رشید میں سے تھے۔ شاہ محمد اسحاق، شاہ عبدالعزیز (1778-1875) کے نواسے تھے۔ دونوں ہی مولانا مملوک علی کی رہ نمائی میں تعلیم حاصل کر چکے تھے، اور مولانا مملوک علی شاہ عبدالعزیز کے شاگرد مولانا رشیدالدین دہلوی کے شاگرد تھے۔ علاوہ ازیں، یہ دونوں ہی حاجی امداداللہ (1817-1899) کے مرید تھے جو بعد میں مکہ ہجرت کر گئے تھے اور مہاجر مکی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ شاہ محمد اسحاق نے سید احمد بریلوی کے جہاد کی تحریک کو منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس تحریک کی اخلاقی اور اصولی حمایت کرنے کے علاوہ انھوں نے مجاہدین کی رسد کی فراہمی کا اہم ترین ذمہ بھی لے رکھا تھا، اور اس ذمے داری کو انھوں نے بہ حسن و خوبی نبھایا۔ 1840 میں تحریک کی ناکامی کے بعد وہ مکہ ہجرت کر گئے اور اسی کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ حاجی امداداللہ ان کے رابطے میں آئے اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ بعد میں وہ مولانا ناصرالدین کے مرید ہو گئے جو شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ رفیع الدین کے پوتے اور شاہ محمد اسحاق کے شاگرد اور داماد تھے۔ مولانا ناصرالدین بھی سید احمد بریلوی کی جہاد تحریک سے بڑی قریبی نسبت رکھتے تھے اور 1831 میں بالاکوٹ کے سانحے کے بعد اس تحریک کے احیاء میں انھوں نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔

اس مختصر سی روئداد سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جو دارالعلوم دیوبند کے بنیاد گزاروں میں سے تھے، دراصل شاہ ولی اللہ کی عالمانہ اور اصلاحی روایت اور سید احمد بریلوی کی جہاد تحریک کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ لوگ معاشرے کی بہت سی ان خرابیوں کی بیخ کنی کے جذبے سے معمور تھے جو اسلامی عقائد میں در آئی تھیں اور اب آہستہ آہستہ مسلم معاشرے کی جڑوں کو گلا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا تعلق مزاحمت کی اس سنہری روایت سے بھی تھا جو ملک سے انگریزوں کو باہر کرنے کے واسطے ان سے لوہا لینے کے لیے شروع کی گئی تھی، یہی سبب ہے کہ جب آزادی کی پہلی تحریک 1857 میں شروع ہوئی تو یہ لوگ اس میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شامل تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا مرکز شاملی تھا جو اتر پردیش کے مظفر نگر ضلع کا ایک قصبہ ہے؟ کچھ عرصے کے لیے اپنے علاقے سے انگریزوں کو بھگانے میں یہ لوگ کامیاب بھی رہے اور انتظامیہ کا کام سنبھالا۔ حاجی امداداللہ، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی خود بھی انتظامیہ کے کئی شعبوں کے نگراں تھے۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد یہ لوگ انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوتے ہوتے بچے۔ انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری سے بچنے کے لیے حاجی امداداللہ کو ہجرت کر کے مکہ جانا پڑا، وہی اس تحریک کے روح رواں تھے۔ بغاوت کی ناکامی کے باوجود ان لوگوں کے دلوں میں برطانوی حکمرانی کے خلاف بغاوت کی جو آگ جل رہی تھی وہ سرد نہیں پڑی۔ جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی، دیوبند کے علماء نے اس میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا اور صفِ اول کے لوگوں میں شامل رہے۔ جمعیۃ العلماء جس میں بیش تر لوگ دیوبند کے فارغین تھے، جدوجہد آزادی کا ایک اہم ستون رہی اور اس مقصد کے حصول میں اس نے اہم کارنامے انجام دیے۔

1857 کی بغاوت کی ناکامی کے بعد لوگوں کے دلوں کے جذبے تو سرد نہیں پڑے لیکن یہ بات واضح ہو گئی کہ بدلے ہوئے حالات میں اب ہتھیار بند ہو کر لڑنا ممکن نہیں رہا ہے۔ اب غیر ملکیوں اور ان کے تہذیبی تسلط کے خلاف جنگ تو جاری رہنی چاہیے لیکن یہ جنگ اب ہتھیاروں کے بجائے قلم اور زبان کی جنگ ہونی چاہیے۔ انگریزوں نے اس بغاوت کو نہایت بے رحمی سے کچلا تھا اور اپنی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بے شمار معصوم اور بے گناہ

لوگوں کو تہ تیغ کر ڈالا تھا۔ سیاسی اقتدار چھن جانے، اعلا عہدوں سے اخراج اور بڑے پیمانے پر جان مال کے بے تحاشا زیاں نے مسلمانوں کو جان لیوا صدمات دیے تھے اور ان کی ہمت توڑ دی تھی۔ اس صورت حال میں ان لوگوں کے سامنے سب سے اہم راستہ یہی تھا کہ مذہبی عقائد اور طور طریقوں کی درست تعلیم کو فروغ دیا جائے اور علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جن میں سچی مذہبی تعلیمات یکجا ہو گئی ہوں اور وہ اپنی قوم کی مذہبی رہ نمائی کریں اور مذہبی ورثے کے تحفظ میں کلیدی خدمات انجام دیں۔ اس کے لیے لازم تھا کہ اس میں اصلاح معاشرہ کا کام بھی ان مقاصد کے پیش نظر شامل ہو جن مقاصد کی وہ تبلیغ کرتے تھے اور جو ان کو شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی کے خلفاء سے ورثے میں ملے تھے۔ اس نصب العین تک رسائی کے لیے بہترین راستہ ایک ایسے مدرسے کا قیام ہو سکتا تھا جس میں ایسے علماء کی تعلیم و تربیت کا کام ہو سکے جو مستقبل میں اس نصب العین کے لیے کام کریں۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد اسی مقصد کے حصول کے لیے ڈالی گئی تھی۔

دیوبند مدرسہ امتیازی اوصاف کا حاصل مدرسہ تھا اور مسلم تعلیم کی طویل روایت میں یہ ایک نئے تصور کا نمائندہ تھا۔ اس کی مالی ضرورتوں کے لیے عوام سے چندہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ ایسا کام تھا جس کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا۔ اس سے قبل تعلیمی اداروں کے قیام اور انتظام کی ذمے داری حکومت کی سمجھی جاتی تھی۔ معروف وممتاز علماء بھی علمی مراکز کا کام کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو اپنی ڈیوڑھیوں یا مسجدوں میں تعلیم دیتے تھے لیکن ایسے تعلیمی ادارے کا قیام جس کا انحصار عوامی عطیات پر ہو، ایک بالکل نیا تصور تھا۔ اس کی وجہ سے مذہبی تعلیم کا فریضہ اور تمام ذمے داری خود قوم ہی پر آ گئی جس کے سبب اس اعلا مقصد سے قوم کی وابستگی بڑھی اور شرکت یقینی بنی۔

اس طریقۂ کار کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حکومت یا کسی دوسرے ادارے کی مدد کے بغیر لاتعداد مدرسوں کے قیام کے امکانات کے دروازے کھل گئے۔ بدلے ہوئے حالات مذہبی تعلیم اور رہ نمائی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بے حد سازگار تھے۔ مذہبی تعلیم کے میدان میں ہندوستان میں آج بھی اسی ماڈل کی تقلید کی جاتی ہے۔ یہ طے کیا گیا کہ اس مدرسے کا انتظام شوریٰ کے ہاتھوں میں ہوگا، کسی ایک گروہ کے ہاتھ میں نہیں۔ سرکاری مداخلت ہر حال میں مسترد کر دی جائے گی۔ گذشتہ تعلیمی اداروں میں تعلیم کا انتظام غیر رسمی تھا۔ اس کے برخلاف اب یہ طے کیا گیا کہ باقاعدہ نصاب بنا کر طالب علموں کو ایک معینہ کورس میں داخلہ دیا جائے گا جس کو ایک معینہ عرصے میں ختم کرنا ہوگا اور طالب علموں کی استعداد کا اندازہ لگانے کے لیے باقاعدہ امتحان ہوا کریں گے۔ امتحانوں کے نتائج کے مطابق طالب علم کامیاب اور ناکام قرار دیے جائیں گے۔ کامیاب طالب علموں کو دارالعلوم سے فارغ ہونے کی اسناد دی جائیں گی۔ دیوبند مدرسے نے یقیناً اپنے ان اقدامات سے ایک نئی راہ روشن کی آئندہ دنوں میں جس کی سبھی نے پیروی کی، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی اسی راستے پر چلے جو دیوبند سے اختلاف رکھتے تھے۔

درسِ نظامی کو دیوبند کا نصاب قرار دیا گیا تھا۔ یہ نصاب سہالی کے ملا نظام الدین (م 1748) نے ترتیب دیا تھا۔ 1691 میں جب ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین کا قتل ہو گیا تو اورنگ زیب نے ان کے خاندان کو ایک وسیع حویلی لکھنؤ میں دے دی تھی جو بعد میں فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی۔ فرنگی محل علم و دانش کا ایک اہم مرکز بن گیا اور اس کے مکین بھی فرنگی محلی خاندان کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس خاندان میں کئی نسلوں تک کئی بڑے عالم اور دانش ور پیدا ہوئے اور آج بھی اس خاندان کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم کا نصاب کسی نہ کسی حد تک غیر متوازن ہے کیونکہ اس میں ان موضوعات کو اہمیت دی گئی ہے جن کو آج ضروری نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں منطق، فلسفے اور قواعد کو دوسرے چند اہم مضامین کے مقابلے میں زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی جیسی عبقری شخصیت کی مستقل کوششوں کے باوجود فلسفے کو نصاب سے نہیں نکالا جا سکا۔ لیکن احادیث کے معاملے میں یہ نصاب درس نظامی کی سفارشات سے آگے بڑھ گیا۔ در حقیقت حدیث کی تعلیم لازمی کی گئی۔ اساتذہ کی برادری میں شیخ الحدیث کو سب سے بلند مقام ملا، جو حدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی طرز پر فقہ کی تعلیم دارالعلوم ہی کے ساتھ مخصوص ہو گئی اور فقہِ حنفی مسلک کی سخت پابندی دیوبند دبستان فکر کا طرہ امتیاز ٹھہرا۔ اس وقت مسلم معاشرے میں جس قسم کا انتشار تھا اس کے سبب غالباً اتحاد قائم کرنے کے لیے اس قسم کا اقدام مناسب رہا ہو لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ مسلکی تفرقوں اور ہٹ دھرمی کی نذر ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ اسی کو دور کرنے کے لیے زندگی بھر کوششیں کرتے رہے تھے۔ اسی طرح قرآن کے مطالعات کو وہ مقام نہیں ملا جو حدیث کو دیا گیا۔ یہ بات بھی افسوس ناک ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانیان سائنسی علوم کی تعلیم کے خلاف نہ تھے لیکن عملی طور پر یہ ہوا کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو نصاب میں جگہ نہ مل سکی۔ یہ ایک

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU
IMC LIBRARY
Hyderabad

بہت بڑی کمی تھی اور اس کے اثرات ماضی قریب میں اس وقت تک محسوس کیے جاتے رہے جب تک دارلعلوم دیوبند کی روایت کے زیر اثر آنے والے مدرسوں کی اکثریت نے اس کی ضرورت کو محسوس کرنا نہ شروع کیا کہ انگریزی پڑھنا اب ضروری ہوگیا ہے، اور اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اپنے نصاب میں انگریزی زبان کی تعلیم کا اضافہ کردیا۔

دیوبند نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں خوب کامیابی حاصل کی اور بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس نے اپنی ایک علاحدہ شناخت بنالی۔ مذہبی روایت میں ایک خاص دبستان فکر کا وہ نمائندہ ادارہ بن گیا۔ یہ روایت اصلاح شدہ مذہبی عقائد اور طور طریقوں کی روایت تھی۔ جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ یہ روایت دراصل شاہ ولی اللہ کے جانشین کی روایت ہی کا تسلسل تھی لیکن اب اس کا سارا زور رسوم اور عقائد کی اصلاح پر تھا، دانش ورانہ ارتباطِ باہمی اور مفاہمت پر نہیں جو کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کا مقصد تھا۔ یہ بھی ہوا کہ دیوبند تحریک کا حلقۂ اثر بڑھنے اور تحریک کے پھیلنے کے امکانات بہت زیادہ بڑھ گئے جس سے اس نظریۂ فکر کی تبلیغ کے امکانات بھی بہت بہتر ہوئے۔ قوم کو انھوں نے وہ رہنمائی دی جس کو لوگ مشترکہ رہنمائی کہتے ہیں۔ انھوں نے شریعت اور طریقت کے متوازن راستے کی جانب لوگوں کو گامزن کیا۔ مختلف سلسلہ ہائے صوفیاء نے طریقت کے راستے کو اپنایا ہے لیکن دیوبند کے ذریعے ایک متوازن راستے تک رہ نمائی کا مطلب یہ تھا کہ معاشرے میں تصوف کی اہمیت اپنی جگہ مسلم لیکن اس کو شریعت کی حدود میں رہنا چاہیے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے پیروکاروں کو تاکید کی کہ وہ ایسے تمام رسم ورواج اور عقیدے ترک کردیں جن کی شریعت میں ممانعت ہے یا جو مشکوک ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا دیوبند کا حلقۂ اثر بھی بڑھتا گیا اور آہستہ آہستہ وہاں ایسے اصول مرتب ہوئے جن میں اصلاح شدہ مذہب کی وضاحت کی گئی تھی۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ دیوبند کے اثرات اپنے گردونواح یا صرف شمالی ہندوستان تک محدود نہ تھے بلکہ دور دراز کے علاقوں میں مثلاً چٹاگونگ، پشاور اور مدراس تک اس کے اثرات کی رفرمائی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے مسلمان مذہبی معاملات میں رہ نمائی اور سربراہی کے لیے دیوبند کی طرف دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ دیوبند نے رہ نمائی کی یہ بڑی ذمے داری سنبھال لی، اور درست بھی یہی ہے کہ دارلعلوم اسی مقصد کے تحت قائم بھی کیا گیا تھا۔ ایسی صورت حال پیدا کرنے میں درج ذیل اسباب کارفرما تھے۔

بالکل شروع سے ہی دیوبند ملک کے مختلف خطوں کے طالب علموں کی توجہ اور کشش کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں سے بہت سے طالب علم ایسے علاقوں سے آتے تھے جن کا تہذیبی ماحول شمالی ہندوستان اور خصوصاً مغربی اتر پردیش کے تہذیبی ماحول سے یکسر مختلف تھا جہاں دارالعلوم قائم تھا۔ یہ لوگ اردو زبان کو نہ تو آسانی سے بول سکتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے جبکہ یہاں اردو مذہبی ذریعہ تعلیم تھی۔ لیکن جب تک ان کی تعلیم مکمل ہوتی تھی اس وقت تک ان کی اتنی تربیت ضرور ہوجاتی تھی کہ وہ مذہب سے متعلق بہت سی ذمے داریوں کو اپنے کندھے پر لے سکیں۔ مثلاً یہ کہ وہ امام، مبلغ اور استاذ کے طور پر مذہبی معاملات میں قوم کی ہدایت، رہ نمائی اور تعلیم کا کام کرسکتے تھے۔ اپنے اپنے علاقوں میں ان کی حیثیت دیوبند کے نمائندگان اور سفیران کی ہوتی تھی۔ یہی لوگ دیوبند کے نقطہ نظر کی تبلیغ کا بھی وسیلہ تھے۔ ایسے بہت سے علاقے تھے جہاں کبھی کوئی عالم نہیں پہنچا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی۔ اب ہر علاقے میں ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جن کی جانب مقامی لوگ رہ نمائی کی غرض سے دیکھ سکتے تھے اور مذہبی معاملات میں ان سے مشورہ کرسکتے تھے۔ بیشتر صورتوں میں ان علماء کا تعلق انھی علاقوں سے ہوتا تھا جس کو وہ اپنا مستقر بناتے تھے، اور اسی لیے ان کے ساتھ رابطہ آسان تھا۔

دیوبند مدرسے کا قیام اور اس کی کامیابی نے وہ حالات پیدا کردیے جن سے نئے نئے مدرسے وجود میں آنے لگے۔ یہ مدرسے دیوبند کی روایت ہی سے نکلے تھے اور اسی کے مقاصد کو آگے بڑھا رہے تھے۔ وہ لوگ جن کو دارلعلوم دیوبند کے اغراض ومقاصد سے اتفاق ہوتا تھا اور جو یہ مانتے تھے کہ صرف اسی راستے پر چل کر قوم کے مستقبل کو ایک غیر ملکی سیاسی نظام سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے، وہ لوگ اسی قسم کے دیگر مدرسے کھولنے کی جانب مسلسل راغب ہوتے رہے۔ اس قسم کا پہلا ادارہ مظاہر العلوم تھا جو سہارن پور میں قائم کیا گیا۔ دارلعلوم دیوبند کے چند ماہ بعد ہی اس کی بنیاد رکھ دی گئی اور یہ ادارہ دیوبند کے بعد دوسرے نمبر پر بہت بڑے مذہبی مرکز کی حیثیت اختیار کرگیا۔ اس کے بعد تو اس قسم کے مدرسے ایک کے بعد ایک مسلسل قائم ہوتے رہے۔ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ملک بھر میں پھیلے ہوئے ان مدرسوں کی تعداد تین درجن سے کم ہرگز نہ تھی۔ اگلی صدی میں ہزارہا مدرسے کھولے گئے۔ اب دیوبند کی حیثیت تقریباً ان اداروں کا انسلاک کرنے والی دانش گاہ جیسی ہوگئی۔ ان تمام مدرسوں میں ایک ہی نصاب تعلیم تھا اور دارلعلوم ان سب کا مرکزی دفتر اور مقصد بن گیا۔ چونکہ ان میں سے بیش تر مدرسوں کا قیام وانتظام ان لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا جو دیوبند سے فارغ تھے اس لیے

دارلعلوم کے ساتھ ان کے روابط بے حد مضبوط تھے۔اس سے ملک گیر سطح کا ایک بڑا مضبوط نیٹ ورک تیار ہو گیا۔دارلعلوم کے ساتھ ان کے رشتے بڑے مضبوط تھے اور یہ رہ نمائی کے لیے دیوبند ہی کی جانب دیکھتے تھے۔ ان کے منتظمین اور اساتذہ کے روابط دارلعلوم دیوبند کے منتظمین اور اساتذہ کے ساتھ استادی شاگردی کے روابط اور بعض اوقات پیر مریدی کے روابط ہوتے تھے۔ان مدرسوں کے فارغین میں سے کچھ لوگ اعلا تعلیم کے لیے دارلعلوم دیوبند بھی جاتے تھے جس سے یہ روابط مزید مضبوط ہوتے تھے۔اس صورت حال کے سبب دیوبند دبستان فکر کی موثر تبلیغ کے لیے راستے کھل گئے اور ان کے نظریۂ مذہب کو خوب فروغ ملا۔قوم کے درمیان ان کو جو حیثیت حاصل ہو گئی تھی اس میں یہ لوگ پاکیزگی اور عقیدے کے پیمانے اور معیار طے کرنے کے بھی مجاز ہو گئے اور اسی وجہ سے قوم پر ان کی گرفت مضبوط ہوئی۔

اس طرح دیوبند اور اس سے منسلک مدرسوں کے فارغین ملک کے بہت سے حصوں میں پھیل گئے جن کا کام مذہب کی تعلیم دینا اور رہ نمائی کرنا ہے۔ عام لوگ مذہبی مسائل کے حل کے لیے لوگ ان سے رجوع کرتے ہیں۔لیکن کبھی کبھی ایسی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے کہ مقامی طور پر کوئی عالم مہیا نہیں ہوتا یا پھر مسئلہ اس قدر ٹیڑھا ہوتا ہے کہ اس کے حل کے لیے اعلا مذہبی عالم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر لوگ شروع سے ہی دارلعلوم دیوبند سے رجوع کرتے رہے ہیں۔مختلف اساتذہ اس قسم کے مسائل کا حل انفرادی طور پر پیش کرتے رہتے تھے لیکن جب مطالبات زیادہ بڑھ گئے تو ایک علاحدہ شعبہ قائم کر دیا گیا جس کا نام دارالافتاء ہے۔دارلافتاء میں مفتی ان تمام ذمے داریوں کو اٹھاتا ہے۔یہی وہ شعبہ ہے جس کے سبب دارلعلوم کو سب سے زیادہ قوت ملی اور وہ مسلمانوں کے تمام مذہبی معاملات کا سرپرست ہو گیا۔مختلف قسم کے مسائل پر فتوے لینے کے لیے لوگ مفتی کے پاس آتے ہیں۔فتویٰ دراصل کسی شرعی مسئلے پر مذہبی رائے کا حکم رکھتا ہے۔یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی شریعت یا قانون میں مذہبی اور شہری دونوں قسم کے قوانین شامل ہیں۔ دارالافتاء کو بڑی تعداد میں مختلف معاملات سے متعلق سوال ملنے لگے اور قانون شریعت کے مطابق وہاں سے فتوے جاری ہونے لگے۔1911 سے ایک رجسٹر میں تمام فتووں کا ریکارڈ درج کیا جانے لگا جو بعد میں شائع کیے جانے لگے یہ کام جس وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1911 سے 1951 تک چالیس سال کے عرصے میں یہاں سے 1,47,850 فتوے جارے کیے گئے۔ یہ فتوے زندگی کے تقریباً ہر پہلو سے متعلق ہیں۔یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ درست مذہبی معاملات پر اطلاعات کے لیے دارلعلوم پر بھروسہ کرنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی۔اس چینل کا استعمال دیوبند نے بھی لوگوں تک مستند مذہبی موقف پہنچانے کے لیے کیا۔جس معاملے کو بھی انھوں نے مذہبی نقطۂ نظر سے نادرست اور مشکوک پایا،اس کی انھوں نے سختی سے مذمت کی اور اصلاح کی کامیاب کوششیں کیں۔

ایسے اور بھی شعبے اور طریقے تھے جن کی مدد سے دیوبند کے علماء نے اپنے پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا۔جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، انھوں نے اہلِ حدیث اور وہابیوں کی طرح تصوف کو مسترد نہیں کیا۔بلکہ ان کے بہت سے معاملات میں تو صوفیاء اور مشائخ کو بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ان صوفیاء اور ان کے مریدوں کا ایک طویل سلسلہ ملک کے کونے کونے میں پھیلا ہوا تھا۔شیخ کو اپنے مریدوں پر مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اپنے اس مکمل اختیار کو انھوں نے نہ صرف تصوف کو ان تمام غیر اسلامی عناصر سے پاک کرنے کے لیے استعمال کیا جو ان کے طور طریقوں اور عقائد میں داخل ہو گئے تھے بلکہ انھوں نے مذہب کی اصلاحی تشریح کا کام بھی کیا۔اسی طرح دیوبند کے علماء نے بھی اپنے قلم اور زبان کا استعمال نہ صرف مذہب کے دفاع کے لیے کامیابی سے کیا بلکہ انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات کی تبلیغ بھی کی۔بہت سے علماء نے بڑی تعداد میں کتابیں لکھنے کا کام سنبھالا۔خالص علمی کتابوں کے علاوہ انھوں نے بڑی تعداد میں سماجی مذہبی موضوعات پر کتابیں بھی اردو میں شائع کیں تاکہ لوگ اپنی طرز زندگی میں اصلاحیں کر سکیں اپنے معاشرے کی تعمیر مستند مذہبی تعلیمات پر رکھی۔اس میں وہ کتابیں بھی شامل تھیں جو عیسائی مشنریوں، دوسرے مذہب کے لوگوں اور ان مسلم گروہوں کی سرگرمیوں کی تردید میں لکھی گئی تھیں جن کو ان لوگوں نے مذہبی طور پر بھٹکا ہوا تسلیم کر لیا تھا۔دیوبند نے ایسے بھی بہت سے ماہر مقررین اور مناظرین پیدا کیے جنھوں نے مختلف جماعتوں کی جانب سے اسلام پر کیے جانے والے کی نظریاتی حملوں سے اس کا دفاع کیا۔ خطابت کی اپنی مہارت کا استعمال کر کے یہ لوگوں کو متوجہ کرتے اور یہ یقین دلاتے تھے کہ لوگوں کو اخلاقی اور مذہبی طور پر ایمان دارانہ اور راست زندگی گزارنی چاہیے۔ان تمام معاملات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم معاشرے کی اصلاح کے میدان میں دارالعلوم دیوبند کی بڑی خدمات رہی ہیں۔

26.5 علی گڑھ تحریک Aligarh Movement

مسلمانوں کے مسائل کا ایک دوسرے قسم کا جواب علی گڑھ تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ تحریک دیوبند تحریک سے یکسر مختلف اور متضاد تھی، حالانکہ ان دونوں ہی تحریکوں کا منبع ایک ہی قسم کے مسائل اور سروکار تھے۔ جن لوگوں نے اس تحریک کی شروعات کی ان لوگوں کا پس منظر حالانکہ بالکل ہی مختلف تھا پھر بھی چند اہم توجہ طلب مماثلتیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ سید احمد جن کو عرفِ عام میں سرسید کہا جاتا ہے، 17 اکتوبر 1817 کو ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوئے جس کا مغل دربار سے قریبی تعلق تھا۔ ان کے اجداد ایک طویل عرصے سے سرکاری ملازمتوں میں تھے اور ان کو بھی مغل دربار دیکھنے کا موقع ملا تھا جو بعد میں اپنے شاندار ماضی کی بس ایک ہلکی سی جھلک ہی بچا تھا۔ مذہبی نقطہ نظر سے ان کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو تصوف اور اصلاح کی بہترین مخلوط روایت کا پروردہ تھا۔ ان کے والد سید متقی دہلی کے اپنے زمانے کے معروف ترین بزرگ صوفی شاہ غلام علی کے شاگرد تھے۔ شاہ غلام علی، مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں نقش بندی سلسلے کے معروف بزرگ تھے اور ان کی رودادری اور کشادہ خیالی کو سب لوگ جانتے تھے۔ شاہ غلام علی سید متقی اور ان کے اہل خانہ سے بہت التفات برتتے تھے۔ انھوں نے سید متقی کے بیٹے کا نام احمد رکھا اور اس کی بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی۔ سید احمد نے اپنے مزاج کی ہمہ گیری اور کشادہ دلی ان کی خانقاہ ہی سے جذب کی ہوگی۔ دوسری جانب ان کی ننھیال کے لوگ شاہ ولی اللہ کے ورثاء اور خلفاء سے بہت متاثر تھے۔ سرسید نے مختلف اوقات میں شاہ عبدالعزیز کے شاگرد شاہ محمد اسحاق، شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ رشید الدین دہلوی اور مولانا مملوک علی کے قدموں میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے شاہ اسماعیل کی تقریر بھی سنی تھی اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے علم و دانش سے بے حد متاثر تھے اور اپنی تحریروں میں انھوں نے شاہ ولی اللہ کے افکار کا سب سے زیادہ حوالہ دیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ کے اہل خاندان سے رابطے کے سبب ہی ان کو مسلم معاشرے کی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ دیوبند کے بانیوں نے بھی اصلاح معاشرہ کی تحریک شاہ ولی اللہ کے اہل خاندان ہی سے لی تھی۔ تاہم سرسید نے اپنے لیے جو راستہ طے کیا وہ ان کے راستے سے یکسر مختلف تھا، اور اصلاح کے لیے جوش وجذبہ ان کے دل میں تاعمر موجزن رہا۔ دونوں کے نقطہ نظر میں فرق اس لیے آیا کہ سرسید مسلمانوں کے نہ صرف شاندار ورثے سے واقف تھے بلکہ اس ورثے کو محفوظ رکھنے کی ضروت سے بھی واقف تھے اور ان حالات اور زبردست تبدیلیوں کا بھی انھیں بخوبی علم تھا جو 1857 کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد واقع ہو رہی تھیں۔ اس نئی صورت حال کے ساتھ ایک قسم کی مفاہمت کی فوری ضرورت کو بھی وہ محسوس کر رہے تھے۔ ایسے میں یہ بالکل فطری امر تھا کہ ان کا راستہ اپنی کیفیت میں علمائے دیوبند کے راستے سے مختلف ہو گیا۔

1838 میں علم و دانش کو ان کا سب سے اہم عطیہ 'آثار الصنادید' کی تالیف ہے۔ یہ کتاب دہلی کے آثار قدیمہ سے متعلق ہے اور اس موضوع پر کسی بھی ہندوستانی شخص کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کی تالیف کے سبب انھیں 1864 میں رایل ایشاٹک سوسائٹی کا اعزازی رکن بنا دیا گیا۔ تاریخ سے ان کی دلچسپی ہمہ گیر تھی اور آئندہ دنوں میں انھوں نے تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری اور تزک جہانگیری کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر اور بھی کتابیں خود لکھی اور شائع کیں۔ سرسید نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے تک چھوٹے موٹے عہدوں پر کام کرنے کے بعد انھوں نے منصف کا امتحان پاس کر لیا۔ مین پوری میں ایک مختصر سا عرصہ گزارنے کے بعد ان کا تقرر فتح پور سیکری میں ہو گیا۔ غالباً سیکری ہی میں اکبر کی بنوائی ہوئی شاہی عمارات اور یادگاروں کو دیکھ کر ان کے دل میں تاریخ سیگہری دلچسپی پیدا ہوئی ہوگی۔ بعد میں ان کا تبادلہ دہلی ہو گیا جہاں وہ 1846 سے 1854 تک رہے۔ یہ عرصہ انھوں نے اپنے مطالعے کو وسعت دینے اور چند اہم کتابیں لکھنے میں گزارا۔ کتابیں لکھنے کا شوق پہلے ہی سے تھا اور اب تک ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔

1855 میں انھیں ترقی دے کر 'صدر امین' بنا دیا گیا اور ان کا تقرر بجنور میں ہو گیا۔ 1857 کی بغاوت کے وقت وہ بجنور میں تھے۔ ایک ذمے دار افسر کے طور پر انھوں نے اپنی ذمے داریوں کو بڑی حوصلہ مندی اور ایقان کے ساتھ نبھایا اور کئی بار اپنی زندگی کو مشکلوں میں ڈالا۔ اس دور میں انھوں نے کئی انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ جب انگریزوں نے اپنے اقتدار کو از سر نو قائم کر لیا تو انھوں نے سرسید کو ان کی خدمات کے صلے میں انعام دینا چاہا لیکن سرسید نے انکار کر دیا اور اپنے بدنصیب ہم وطنوں کی قیمت پر زمینداری قبول نہیں کی۔

بغاوت کے بعد جو تباہ کاریاں ہوئیں انھوں نے سرسید کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ معصوم اور بے قصور لوگوں کا قتل عام، جان و مال کا نقصان، تباہی اور تاراجی اتنے وسیع پیمانے پر ہوئی کہ اس کو دیکھ کر ایک بار کو سرسید کے دل میں ہجرت کر جانے کا خیال بھی آیا لیکن ان کے باطن اور ذاتی خوبیوں نے اس کی اجازت نہ دی کہ اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لیے وہ اپنی قوم کو پریشانیوں میں گھرا چھوڑ کر چلے جائیں۔ بالآخر انھوں نے یہ طے کر لیا کہ ان کے حالات کو بدلنے، ان کے مسائل حل کرنے اور ان کی ترقی کے لیے کام کریں گے۔ اپنی بقیہ زندگی انھوں نے اسی نصب العین کے حصول میں گزار دی۔

1857 کی عظیم جدوجہد کی ناکامی کے بعد آنے والے دنوں میں سرسید نے دوشاخی حکمت عملی اختیار کی۔ ان کا پہلا کام تھا حالات کے شکار بدنصیب لوگوں کو راحت رسانی اور برطانوی عتاب سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا۔ دوسرا کام ان کو مایوسی اور ذہنی تعطل کی فضا سے باہر نکالنا جس میں انھوں نے اس تباہ کاری کے نتیجے میں خود کو گھرا ہوا پایا۔ ہندوستان کے متعلق برطانوی پالیسی میں کچھ بنیادی خامیاں تھیں جن کی وجہ سے اس قسم کے حالات پیدا ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں ان خامیوں کی طرف ان کو متوجہ کرنے کے لیے انتہائی جرأت مندی اور ایقان کی ضرورت تھی جب انگریز اپنی فتح کے نشے میں چور تھے اور شکست خوردہ لوگوں کے لیے ان کے دل سخت عداوت اور دشمنی کے جذبوں سے معمور تھے، لیکن سرسید نے اپنے ہم وطنوں اور حکمرانوں دونوں کے تئیں اپنے فرض سے ذرا بھی کوتاہی نہیں برتی۔ ان کی کتاب 'اسباب بغاوت ہند' کی تالیف ایک بے حد جرأت مندانہ قدم تھا جس کی وجہ سے ان پر غداری کا الزام لگتے لگتے بچا۔ اس کتابچے میں انھوں نے اپنی بہترین تجزیاتی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی بے باکی سے انگریزوں کی ان پالیسیوں پر انگشت نمائی کی ہے جن کی وجہ سے بے اطمینانی اور انتشار پھیلا تھا اور جن کے نتیجے میں 1857 کا سانحہ وجود میں آیا تھا۔ انھوں نے ایسے اقدامات کی طرف بھی اشارہ کیا جو اعتماد اور امن کی بحالی کے لیے کیے جانے ضروری تھے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت چلانے اور اہم فیصلے کرنے والے اداروں میں ہندوستانیوں کی شمولیت ضروری ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے انگریز حکمرانوں کے کچھ حلقے شکوک وشبہات کا شکار تو ہوئے لیکن حکومت کو وہ یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ فوری طور پر کچھ اصلاحات نہایت ضروری ہیں۔ اس دوران سرسید نے یہ اندازہ بھی کر لیا کہ اچھی تعلیم کے بغیر ہندوستانی ان اصلاحات سے کچھ خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔

اپنے ہم وطنوں، خصوصاً مسلمانوں کی کشتی کو کھینے کا کام کہیں زیادہ مشکل کام تھا کیونکہ وہی حکمرانوں کے انتقام کا شکار ہوئے تھے۔ خاصے غور وخوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تعلیم کی کمی ملک کی پس ماندگی کی سب سے بڑی وجہ ہے اور جدید تعلیم کے بغیر اس صورت حال میں کسی تبدیلی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس ادراک نے ان کی زندگی کو ایک مقصد سے ہم کنار کر دیا اور اب انھوں نے اپنی پوری طاقت اسی کے حصول کے لیے وقف کر دی۔ البتہ اس سلسلے میں کوئی حکمت عملی طے کرنے میں انھیں کچھ وقت لگا۔ اس تمام عرصے میں ان کا نقطہ نظر دھیرے دھیرے ارتقاء پذیر ہوتا رہا جسے بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ اس سمت میں انھوں نے پہلا ٹھوس قدم 1859 میں اٹھایا جب وہ مرادآباد میں صدرالصدور کے عہدہ پر متعین تھے، یہاں انھوں نے فارسی کا ایک مدرسہ کھولا جس میں فارسی، جدید تاریخ، انگریزی اور اردو مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ بعد میں 1864 میں غازی پور میں مدرسے کے قیام کے لیے انھوں نے فنڈ جمع کیے۔ اس مدرسے میں انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ راجا ہردیو نارائن سنگھ اس کے سرپرست ہوئے۔ یہ پہلا تعلیمی ادارہ تھا جو عوامی عطیات اور چندے سے قائم کیا گیا تھا اور جس میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقے کے لوگوں نے چندہ دیا تھا۔ یہ کام دارلعلوم دیوبند کو چندے سے چلانے کے لیے علماء کے فیصلے سے بھی پہلے کیا گیا۔ بعد میں یہی مدرسہ وکٹوریہ ہائی اسکول میں تبدیل ہو گیا۔ غازی پور میں ہی سرسید نے مغربی علوم کو عوام تک پہنچانے کا سب سے پہلا اور اہم قدم اٹھایا۔ 1863 میں انھوں نے ٹرانسلیشن سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کا نام بعد میں سائنٹفک سوسائٹی کر دیا گیا۔ اس سوسائٹی کا مقصد جدید فنون لطیفہ، سائنس، تاریخ، علم زراعت، ریاضی، سیاست اور معاشیات وغیرہ کے معیاری ترجمے کر کے شائع کرنا تھا۔ اس طرح مغربی علوم کی چند بہترین نگارشات ان لوگوں کے لیے فراہم ہو گئیں جن تک ان کی رسائی اصل زبان میں کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ 1964 میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا اور یہی وہ شہر تھا جس کے مقدر میں مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کا مرکز بننا تھا اور جہاں اینگلو محمڈن اورینٹل کالج کی بنیاد پڑی تھی جس کو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے پہچانا گیا۔ سائنٹی فک سوسائٹی کا آفس بھی علی گڑھ منتقل ہو گیا اور سرسید کے بنارس تبادلے کے بعد بھی یہ سوسائٹی علی گڑھ ہی میں کام کرتی رہی۔ 1966 میں سرسید نے اپنے افکار کی تبلیغ واشاعت کے لیے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔

اپریل 1869 میں سرسید کی زندگی کا سب سے اہم موڑ آیا۔ اس مہینے میں انھوں نے اپنے بیٹوں سید محمود اور سید حامد کے ساتھ انگلینڈ کا سفر کیا۔ سید

محمود کو انگلینڈ جا کر اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ ملا تھا۔ سرسید نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور خود بھی اس کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ انگریزوں کے نظام تعلیم، اور خصوصاً آکسفورڈ اور کیمبرج میں طریقۂ تعلیم کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ اپنی تعلیمی پالیسی وضع کرنے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگلینڈ میں اپنے قیام کے دوران وہ ایسی معلومات اور مواد جمع کرنا چاہتے تھے جو ولیم میور (William Muir) کی کتاب Life of Mahomet میں شامل غلط بیانیوں کی تردید میں کام آئے۔ اس سفر کے لیے سرسید نے اپنے گھر کو گروی رکھ دیا اور لائبریری فروخت کر دی تاکہ زادِ راہ اور دیگر ضروریات پوری ہو سکیں۔ وہ انگلینڈ کے لیے یکم اپریل 1869 کو روانہ ہوئے اور 2 اکتوبر 1870 کو ہندوستان واپس لوٹے۔ تقریباً 17 مہینے کے اس عرصے میں جو انھوں نے انگلستان میں گزارا، انھوں نے انگلینڈ کے حالات دیکھے اور یوروپی تہذیب کی زبردست کامیابیوں کا مشاہدہ کیا۔ جو کچھ انھوں نے دیکھا اس سے وہ بے حد متاثر تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تمام کامیابیاں تعلیم کی برکتوں کا فیض ہیں۔ اس لیے اہم تعلیمی اداروں کا انھوں نے بطور خاص دورہ کیا اور ایٹن (Eton)، ہیرو (Harrow)، آکسفورڈ (Oxford) اور کیمبرج (Cambridge) گئے۔ ان تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور پروفیسروں کے ساتھ انھوں نے تعلیم کے مسائل پر گفتگو کی۔ انھوں نے اس بات کو خاص طور سے توجہ طلب سمجھا کہ کلاس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے صرف وہی طالب علموں کی کردار سازی نہیں کرتا بلکہ اس کے آس پاس کے تمام ماحول کا بھی بہت اہم رول اس میں ہوتا ہے۔ اس میں بورڈنگ کی زندگی، کھیل کا میدان، سماجی جلسے اور بحث و مباحثے کی محفلیں سب کچھ شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک لوگوں کی شخصیت کو بنانے میں کچھ نہ کچھ کام آتا ہے جس کے لیے انگریزوں کو شہرت حاصل ہے۔ یہاں آ کر ان کے اس خیال کو تقویت ہی ملی کہ اچھی تعلیم کے بغیر ان کے ہم وطن تعظیم و توقیر اور ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کیمبرج اور آکسفورڈ کے خطوط پر ایک ادارے کے قیام کے بارے میں خاکہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ انگریزوں کے معاشرے کو بنانے اور اس پر گہرا اثر ڈالنے کے باوجود یہ تعلیمی دانش گاہیں اپنی حکومت پر منحصر نہ تھیں اور اس کے اثرات سے غیر معمولی طور پر آزاد تھیں۔ اس میں انھیں اپنے لوگوں کی تعلیم کے لیے نجی اقدام کا امکان نظر آیا۔

لیکن اس مقصد کے حصول کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بھی تھی۔ عام مسلمان مغربی تعلیم کے خلاف تھے۔ انگریزی تعلیم کی جانب ان کو راغب کرنا سرسید کے لیے بڑا چیلنج تھا۔ ترقی کی کوئی امید اس وقت تک نہ کی جا سکتی تھی جب تک کہ قوم کا نقطۂ نظر نہ بدلے۔ قدیم اور فرسودہ طرز فکر اور معاشرتی خرابیوں کی دلدل سے ان کو نکالنا بہت ضروری تھا۔ اس کے لیے معاشرے کی اصلاح کے اقدامات ناگریز ہو گئے۔ وہ جب تک وہ مذہبی تعصّبات ختم نہ کیے جاتے جنھوں نے مسلمانوں کو نئی طرزِ زندگی اختیار کرنے سے روک رکھا تھا اور جو ان کے سماجی رویوں میں تبدیلی کا باعث بن سکتی تھی، اس وقت تک یہ قوم مغربی طرزِ تعلیم سے کسی طور فائدہ نہ اٹھا سکتی تھی۔ انگریزوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرنا بھی سرسید نے ضروری خیال کیا۔ اسی لیے وہ مسلم معاشرے کی تعمیرِ نو اسلام کی بنیادی تعلیمات کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے۔ ایسے میں بہت سی رسم و رواج اور طور طریقے تھے جو مسلم معاشرے میں سینکڑوں برسوں پہلے داخل ہو گئے تھے اور ان کا اسلام کی روح اور تعلیمات سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ ایسی تمام خرابیوں کا دور کیا جانا ضروری تھا۔ اس کام کے لیے انھوں نے ایک رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات لوگوں تک پہنچا سکتے تھے۔ رسالہ جاری کرنے کا خیال انھیں انگریزی رسالوں Taler اور Spectator سے آیا تھا جن کی ادارت کا کام انگریزی کے معروف ادیبوں نے سنبھال رکھا تھا اور جس کے انگریز معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ انگلینڈ سے وطن کے لیے روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کا خاکہ تیار کیا۔ اس رسالے نے بعد میں مسلم معاشرے پر گہرے اثرات ڈالے اور ادبی ڈسکورس کے نئے پیمانے قائم کیے۔

ہندوستان لوٹنے سے قبل انھوں نے وہ دوسرے کام بھی پورے کیے جو انگلستان کے لیے روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے اپنے ذمے لیے تھے۔ برطانوی کتب خانوں میں موجود مواد سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب کا بڑا موثر جواب لکھا۔ ان کی یہ تصنیف خطبات احمدیہ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ساتھ ساتھ انگریزی میں اس کی اشاعت کا اہتمام بھی انھوں نے کیا۔ اس کتاب میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر لگائے گئے الزامات کا جواب دیا گیا ہے۔ اسلام کا دفاع انھوں نے صرف اسی کتاب تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ زندگی بھر ان الزامات سے اسلام کا دفاع کرتے رہے جو وقتاً فوقتاً یوروپی اسکالر اسلام پر عائد کرتے رہتے تھے۔

اکتوبر 1870 میں انگلستان سے واپس لوٹ کر سرسید نے تمام تر قوت بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ اپنے مقاصد کے حصول میں لگادی اور انگلینڈ میں بیٹھ کر قوم کی بہتری کے لیے جو خاکہ انھوں نے مرتب کیا تھا اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ سال کے ختم ہوتے ہوتے رسالے کی اشاعت شروع ہوگئی اور 24 دسمبر 1870 کو یہ رسالہ کتب فروشوں اور بک اسٹالوں تک پہنچ گیا۔ اس رسالے نے جو خدمات انجام دیں وہ علی گڑھ تحریک کی تاریخ کے سنہرے اوراق میں درج ہیں۔ اس نے گویا ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دیا اور قوم کو گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ رسالے کے زیادہ تر مضامین سرسید خود لکھتے تھے۔ دوسرے اہم معاونین میں محسن الملک اور چراغ علی کے نام شامل ہیں۔ رسالے کے سرورق پر شائع ہونے والے ماٹو 'محمدن سوشل ریفارمر' (Mohammedan Social Reformer) سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ رسالے کا مقصد مسلمانوں کو اصلاحِ معاشرہ کی جانب متوجہ کرنا اور ان رسم ورواج سے نجات دلانا تھا جن کا تعلق اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کچھ بھی نہ تھا اور وہ قوم کی ترقی میں سدراہ بنے ہوئے تھے۔ رسالے کے تعارفی مضمون میں لکھا تھا کہ رسالے کی اشاعت کا مقصد مسلمانوں کو مکمل طور پر تہذیب یافتہ کرنا ہے کہ وہ مہذب قوموں کے طنز وتضحیک کا نشانہ نہ بن سکیں، اور ان کا شمار بھی دنیا کے مہذب اور معزز لوگوں میں ہونے لگے۔ رسالے میں شامل مضامین لوگوں کی مذہبی حسیت کو چھوتے تھے اور اور رسم ورواج پر تنقید کرتے تھے جو عرصے سے مسلمانوں میں مروج تھے اس لیے اس کو بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ اس کے شائقین کی تعداد بڑھتی رہی، اور بالآخر یہ رسالہ سرسید کے افکار کی تبلیغ کا سب سے اہم آلہ بن گیا اور اس نے لوگوں کے نظریات کو بدلنے میں بڑا موثر کردار ادا کیا۔ اس رسالے نے اردو کو ایک مہذب اور علمی مباحث کی زبان کے طور پر متمکن کرنے میں بہت اہم تعاون دیا۔

ایک ایسے جدید تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھنا جس کا خیال سرسید کو بہت عزیز تھا، ان کے لیے زیادہ مشکل کام بھی تھا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، اس کا خاکہ سرسید نے قیام انگلستان کے زمانے میں ہی تیار کر لیا تھا۔ لیکن راہ میں رکاوٹیں بہت تھیں اور ابھی حکمت عملی کی نزاکتیں اور باریکیاں طے کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔ چونکہ پلان کے مطابق اس کو حکومت کے ہر طرح کے اثر سے محفوظ رکھنا تھا اس لیے اس اقدام کے لیے فنڈ مہیا کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ لیکن سرسید اس قسم کی مشکلوں سے گھبرانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے بڑی دقتِ نظر کے ساتھ فنڈ جمع کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ اس میں گھر گھر جا کر چندہ اکٹھا کرنا، لاٹری ڈالنا اور نمائشوں میں غزل خوانی کرنا شامل تھا۔ وقت گنوائے بغیر انھوں نے اس ادارے کے قیام کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تفصیلات طے کرنے کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان میں منصوبے کے مختلف پہلوؤں کے لیے جائزہ کمیٹیاں اور فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے اقدامات کرنے والی کمیٹیاں شامل تھیں۔ کالج کے لیے جگہ کے انتخاب کا بھی مرحلہ سامنے تھا۔ ادارے کے قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کرنے میں انھوں نے عوامی رائے طلب کی۔ اکثریتی رائے سے علی گڑھ ہی کا انتخاب عمل میں آیا جہاں سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کے دفاتر پہلے سے چل رہے تھے۔ انگلینڈ سے واپس لوٹنے کے بعد چار برس کے اندر 24 مئی 1875 کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (MAO College) کی بنیاد ڈالی گئی اور اسی برس یکم جون سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوگیا۔ وائسرائے لارڈ لٹن (Lord Lytton) نے کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم 8 جنوری 1877 کو ادا کی۔ سرسید ابھی تک بنارس میں متعین تھے۔ لیکن انھیں محسوس ہو گیا تھا کہ اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے ان کا ذاتی طور پر علی گڑھ میں موجود رہنا ضروری ہے۔ انھوں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے لیے عرضی دی اور جولائی 1876 میں علی گڑھ واپس آ گئے اور اپنا سارا وقت قوم کی ترقی کے اپنے خواب کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ کالج کی بنیاد حالانکہ مسلمانوں کی تعلیم وترقی کی غرض سے ڈالی گئی تھی کیونکہ اس میدان میں وہ اپنے ہندو بھائیوں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے، لیکن اس کالج کے دروازے ہر قوم کے طالب علموں کے داخلے کے لیے کھلے تھے۔ ابتدا ہی سے ہندو طلبہ اور اساتذہ ایک معقول تعداد میں اس ادارے سے وابستہ رہے ہیں۔ ایک انگریز سڈونز (Siddons) کالج کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے اور بیج ناتھ پرساد اس کے سیکنڈ ماسٹر تھے۔ کالج کو عطیات اور چندہ دینے والوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ہندوؤں کی تھی۔ بہت سے غیر مسلموں نے بڑی فراخدلی سے چندہ دیا۔ ان میں پٹیالہ، وجے نگر اور بنارس کے مہاراجاؤں کے علاوہ چودھری شیر سنگھ، راجا دیونارائن سنگھ، لالہ پھول چند، ٹھاکر پرساد سنہا، کنور جگت سنگھ، رائے شنکر داس اور سیتا رام وغیرہ شامل تھے۔ راجا جے کشن ہمیشہ سرسید کے ساتھ ساتھ رہے۔ ان لوگوں کے نام کی تختیاں آج بھی اسٹریچی ہال اور سرسید ہال کے کمروں کے سامنے کے حصوں پر لگی ہوئی ہیں۔ سرسید کے انتقال کے وقت کالج کے 349 طلبہ میں 64 غیر مسلم تھے اور کمیٹی کے بائیس ممبران میں سے چھے ہندو تھے۔ 82-1881 میں بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے والے طالب علم کا نام ایشوری پرساد تھا۔

اس تحریک کا اکادمک اور اخلاقی اصول سرسید نے ''آزاد تحقیق، وسیع القلبی اور اخلاق کی پاکیزگی'' قرار دیا تھا اور اس نصب العین کے حصول میں کوئی کوتاہی نہ برتی جاتی تھی۔ کالج بورڈنگ میں بہترین ماحول پیدا کرنے کی ہر کوشش کی جاتی تھی۔ کلاس، ہاسٹل، کھیل کے میدان، ادبی اور بحث مباحثے کی انجمنوں کو اعلاترین معیار سے ہم کنار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔ ابتدائی دنوں سے ہی کالج میں ایک شہسواری کا کلب بھی تھا۔ تعلیم کے لیے بہترین اساتذہ کی خدمات لی گئیں۔ سڈونز کے بعد پرنسپل کے طور پر تھیوڈور بیک (Theodore Beck) کا تقرر ہوا جو کیمبرج سے امتیازی حیثیت کے ساتھ فارغ ہو کر آئے تھے۔ دیگر اساتذہ میں شبلی۔ ٹی، ڈبلیو، آرنالڈ، بھوانی چندر چکرورتی، آسوتوش بھٹا چاریہ، ہیرلڈ کوکس، ٹپنگ، جی ایس گیرے، ایچ ڈگلس، موریسن اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اسی لیے اس میں ذرا بھی حیرت کی بات نہ تھی کہ یہ کالج جلد ہی ان لوگوں کے لیے رول ماڈل بن گیا جو تعلیم کے میدان میں اپنا کوئی نشان چھوڑنا چاہتے تھے۔

سرسید کی خوش قسمتی سے بڑے وفادار اور سنجیدہ قسم کے دوستوں اور حامیوں کا ایک گروہ ان کے اردگرد جمع ہو گیا۔ ان کے دوستوں میں محسن الملک، وقار الملک سمیع اللہ خاں اور دیگر ذی وقار شخصیتیں شامل تھیں۔ یہ تمام لوگ اپنے اصولوں کے لیے وقف بابصیرت اور جرأت مند لوگ تھے۔ قوم کی ترقی کی لگن کی آگ ان کے دلوں میں روشن تھی اور سرسید ہی کی طرح یہ لوگ بھی ہر قسم کی قربانیاں دینے کو تیار تھے۔ انھوں نے ہر مرحلے میں سرسید کا ساتھ دیا اور ان کی حمایت میں ہر قدم پر ساتھ کھڑے ہوئے۔ سرسید کے انتقال کے بعد انھوں نے ان کے مشن کو پوری قوت اور استقلال کے ساتھ آگے بڑھایا اور اسے کامیابی سے ہم کنار کیا۔

اپنے مذہبی خیالات کی وجہ سے سرسید کو خاصے دشمنانہ رویوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا سودمند ثابت ہوگا کہ علی گڑھ تحریک کوئی مذہبی تحریک نہ تھی۔ یہ بنیادی طور پر ایک اصلاحی اور تعلیمی تحریک تھی۔ مذہب کے معاملے میں اس تحریک کے رہ نماؤں میں کوئی اتفاق باہمی نہ تھا۔ سرسید نے اپنے مذہبی افکار اپنے ساتھیوں پر تھوپنے کی کوشش کبھی نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے اپنے مذہبی خیالات کو داخل نصاب کرنے کی کوشش کی۔ کالج میں مذہبی معاملات کا شعبہ مکمل طور پر مولانا عبداللہ انصاری کے حوالے کر دیا گیا تھا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ تھے۔ سرسید کی مذہبی تحریریں یوروپی علماء کے اس گمراہ کن پروپیگنڈے کے خلاف اسلام کے دفاع تک محدود تھیں کہ اسلام میں جدید سائنسی علوم کے لیے گنجائش نہیں ہے اور اسلام کے دائرے میں رہ کر ترقی کرنا ممکن نہیں ہے۔ سرسید کا کامل اعتقاد تھا کہ کائنات کو خدا نے تخلیق کیا ہے اور قرآن کلام الٰہی ہے اس لیے کائنات اور قرآن میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہو سکتا، اور جتنے مادی مظاہر ہیں وہ قانون فطرت کے پابند ہیں۔ وہ کرشموں یا معجزوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ قرآن میں بیان کیے گئے ایسے واقعات جو بظاہر مافوق الفطرت محسوس ہوتے ہیں ان کی تشریح وتوضیح علت ومعلول کے ذریعے کی جانی چاہیے۔ سرسید کے اس قسم کے نظریات اور شرائط نے علماء کے ایک حلقے کو اور عام مسلمانوں کو پریشان اور ناراض کر دیا۔ مذہبی اصطلاح کے تعلق سے ان کے چند خیالات کو تو عوامی قبولیت حاصل ہو گئی (مثلاً عیسائیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا معاملہ جسے اس وقت لوگ مذہب کے خلاف سمجھتے تھے) لیکن ایسے بہت سے افکار ہیں جن کو علماء اکثر تنقید کا نشانہ اب بھی بناتے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے بہت سے مذہبی افکار کو تنقید کا ہدف بنانے میں وہ حق بجانب ہیں یا نہیں، یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یوروپی علماء کے حملوں سے سرسید نے اسلام کا جس طرح دفاع کیا وہ کام اپنے آپ میں بہت عظیم ہے۔

صرف ایک تعلیمی ادارے کے قیام سے پوری قوم کی تعلیمی ضرورتیں پوری نہ ہو سکتی تھیں اور یہ ادارہ اس کی تعلیمی پستی دور نہ کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا کام یہی تھا کہ ایک ایسا ماڈل اور معیار قائم کر دے جس کی تقلید آنے والے لوگ کریں۔ ایک ایسی انجمن کی ضرورت تھی جو علی گڑھ تحریک کے پیغام کو ملک کے کونے کونے میں عام کر دے اور جدید تعلیم اور سماجی اصلاح کی ضرورت کے لیے عوامی بیداری لائے۔ ایسی انجمن کی ضرورت کے پیش نظر سرسید نے دسمبر 1868 میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نعرہ تھا کہ صرف تعلیم ہی قوم کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے۔ آئندہ کئی برسوں تک یہ انجمن مسلم دانش ور طبقے کا سب سے اہم فورم بنی رہی۔ اس کے سالانہ جلسے بڑے اہم ہوتے تھے جن میں شرکاء اور سامعین کو خاصی ذہنی غذا فراہم ہوتی تھی۔ اسی فورم میں شبلی نے اپنی تحقیق کے بہت سے مطالعات پیش کیے اور اپنی بہترین شعری تخلیقات سنائیں۔ حالی نے، جن کو نئی اردو شاعری کا پیش رو کہا جاتا ہے، اپنی مسدس سے غیر تعلیم یافتہ لوگوں تک کے دلوں کو گرما دیا اور ان کو اپنے شاندار ماضی سے متعارف کراتے ہوئے موجودہ حالت زار سے نکلنے کی ضرورت کا احساس کرایا۔ سرسید کے دور حیات میں کانفرنس کے تمام جلسے عملی معاملات کے پیش نظر علی گڑھ ہی میں منعقد ہوئے لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کے

ساتھیوں نے ملک کے تقریباً ہر حصے میں یہ جلسے منعقد کیے۔ یہاں تک کہ بمبئی، لاہور، ڈھاکہ، کلکتہ، مدراس، کراچی، اور برما میں رنگون جیسے دور دراز علاقوں میں ان جلسوں کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح علی گڑھ تحریک کا پیغام دور دراز علاقوں تک پہنچا اور اس نے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کی۔

سرسید کا مقصد ایک یونی ورسٹی کا قیام تھا یہ خواب ان کی زندگی میں پورا نہ ہوسکا لیکن انھوں نے تحریک کو اس راستے پر ضرور ڈال دیا تھا جو اس مقصد کے حصول کی طرف جاتا تھا۔ سرسید کے رفقاء محسن الملک اور وقار الملک نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے رات دن محنت کی۔ 1898 میں سرسید کا انتقال ہوگیا تھا جب کہ محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج کو 1920 میں دانش گاہ یعنی یونی ورسٹی کا درجہ ملا۔ ان کے انتقال کو سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بھی ایک جدید اور فعال یونی ورسٹی بن چکی ہے۔ سرسید صاحب بصیرت شخص تھے اور انھوں نے مسلم معاشرے کی بنیادی خرابیوں کو ٹھیک ٹھاک پہچان لیا تھا جو اس کی جڑوں کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔ ان خرابیوں کو دور کر کے مسلمانوں کی عزت نفس اور خوش حالی کو واپس لانے کی انھوں نے قابل تحسین کامیاب کوششیں کیں۔ ان کے سامنے مشکلات بے شمار تھیں اور سخت ترین تھیں لیکن انھوں نے اپنے ذاتی آرام کا کبھی خیال نہ کیا۔ دشمنانہ مخالفتیں برداشت کیں اور نا مساعد حالات انھیں کبھی اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکے۔ اپنے وفادار ساتھیوں اور حامیوں کے ساتھ انھوں نے وہ سب حاصل کر کے دکھایا جو ان حالات میں بہت سے لوگوں کے لیے ناممکن تھا۔ اگر سرسید نہ ہوتے اور ان کی علی گڑھ تحریک نہ ہوتی تو اندازہ کرنا مشکل ہے کہ برصغیر کے مسلمان کس حال میں ہوتے۔

Summary — 26.6 تلخیص

اس یونٹ میں آپ نے مطالعہ کیا کہ مختلف حالات میں اور مختلف ادوار میں مسلم معاشرے میں کس قسم کے اقدامات اصلاح معاشرہ اور اسلام کی پاکیزگی کو محفوظ رکھنے کے لیے کیے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ برصغیر ہند کے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے میں تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کے قطعی اثرات مذہب اسلام کے رسم و رواج پر بھی پڑے۔ وہابی فرائضی، دیوبند اور علی گڑھ تحریکوں کے اس مطالعے سے آپ کو واضح طور پر اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ان تحریکوں کی ابتدا کن اسباب سے ہوئی اور اصلاح معاشرہ اور اسلام کے احیاء میں ان کی کیا اہمیت تھی۔

Exercises — 26.7 مشق

1. فرائضی تحریک کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں اختصار کے ساتھ اپنے خیالات قلم بند کیجیے۔
2. مذہب اسلام کے نظریات کے فروغ میں دیوبند تحریک کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. علی گڑھ تحریک نے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے کس طرح کی خدمات انجام دیں؟

NATIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD Accn. No. MA-038 Date 03.08.2015
NATIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY HYDERABAD